یکم و ۱۶ نومبر ۲۰۲۱ء | جلد نمبر: ۱۴ ۔ شمارہ نمبر: ۲۰۔۲۱

پندرہ روزہ
معارف فیچر کراچی
MA'ARIF FEATURE

مدیر: سیّد شاہد ہاشمی

نائب مدیران: منعم ظفر خان، سید سمیع اللہ حسینی، نوید نون ۔ معاون مدیران: غیاث الدین، محمد عمید فاروقی

ڈی ۔ ۳۵، بلاک ۔ ۵، فیڈرل 'بی' ایریا، کراچی ۔ ۷۵۹۵۰
فون: ۳۶۸۰۹۲۰۱۔۳۶۳۴۹۸۴۰ (۲۱۔۹۲)
برقی پتا: irak.pk@gmail.com، ویب گاہ: www.irak.pk

Fortnightly "Maarif Feature" Karachi. REG No. SC-1303

۱ ۔ **معارف فیچر** ہر ماہ کی یکم اور سولہ تاریخوں کو شائع کیا جاتا ہے۔ اس میں دنیا بھر سے (ہمیں) دستیاب ایسی معلومات کا انتخاب پیش کیا جاتا ہے، جو اسلام سے دلچسپی اور ملت اسلامیہ کا درد رکھنے والوں کے غور و فکر کے لیے اہم یا مفید ہو سکتی ہیں۔

۲ ۔ پیش کیا جانے والا لوازمہ بالعموم بلا تبصرہ شائع کیا جاتا ہے۔ کسی مضمون، نقطۂ نظر، خیال یا معلومات کے انتخاب کی وجہ اس سے ہمارا اتفاق نہیں، اس کی اہمیت ہوتی ہے۔ کسی مضمون یا معلومات کی مدلل تردید یا اس سے اختلاف پر مبنی لوازمہ کو بھی جگہ دی جا سکتی ہے۔

۳ ۔ **معارف فیچر** کو بہتر بنانے کے لیے مفید معلومات کے حصول یا ان کے ذرائع تک رسائی میں آپ کی مدد کا خیر مقدم کیا جائے گا۔

٤ ۔ ہمارے فراہم کردہ لوازمے کے مزید، لیکن غیر تجارتی ابلاغ کی عام اجازت ہے۔

۵ ۔ **معارف فیچر** کی کوئی قیمت مقرر نہیں۔ تاہم عطیات کی ضرورت بھی رہتی ہے اور عطیات قبول بھی کیے جاتے ہیں۔ **اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی**

افریقا سے وابستہ جدید دنیا کا مستقبل

Howard W. French

افریقا وہ براعظم ہے جسے دنیا نے کم و بیش ہر دور میں نظر انداز کیا ہے، زیادتیوں کا نشانہ بنایا ہے۔ پوری دنیا کے انسانوں پر ایک بہت بڑا قرض یہ ہے کہ افریقا کو اُس کا جائز مقام دیا جائے، اُس سے روا رکھی جانے والی زیادتیوں کا ازالہ کیا جائے، عالمی سیاست و معیشت میں اُس کا جائز مقام محض تسلیم نہ کیا جائے بلکہ اس خطے کے لوگوں کو اُن کے متعلقہ حقوق دیے بھی جائیں۔

دنیا بھر کے پڑھے لکھے لوگ اور مختلف شعبوں کے سرکردہ ماہرین بھی افریقا پر اب تک خاطر خواہ توجہ دینے کے موڈ میں دکھائی نہیں دیتے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اس خطے کے ممالک میں آبادی کا غیر معمولی تنوع جنم لے رہا ہے۔ کم و بیش چالیس سال قبل افریقا کی آبادی ۸۰ کروڑ ہوا کرتی تھی، اب ایک ارب بیس کروڑ کی حد کو چُھو رہی ہے۔ ماہرین کا اندازہ ہے کہ آبادی میں اضافے کی یہی رفتار برقرار رہی تو رواں صدی کے وسط تک افریقا کی آبادی دو ارب کی حد کو چُھو رہی ہوگی۔ اقوام متحدہ کے اعداد و شمار اور پیش گوئی کے مطابق رواں صدی کے خاتمے تک افریقا کی آبادی ساڑھے چار ارب کی حد کو بھی چُھو سکتی ہے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ براعظم چین اور بھارت کی مجموعی آبادی سے زیادہ آبادی کا حامل ہو چکا ہو۔

کسی بھی دوسرے براعظم یا خطے میں آبادی کے حوالے سے اِس نوعیت کی حیرت انگیز تبدیلیاں رونما نہیں ہو رہیں۔ اب ایک لمحے کو ٹھہر کر سوچیے کہ ماہرین کے اندازوں کے مطابق ۲۰۳۰ء تک دنیا بھر کے کام کرنے کی عمر والے لوگوں کا ۲۰ فیصد افریقا میں ہوگا۔ یہ حقیقت اُن سب کے لیے قابلِ توجہ ہونی چاہیے جو افریقا کو کسی قابل گردانتے کے لیے تیار نہیں۔ افریقا افرادی قوت فراہم کرنے والا ایک بڑا خطہ بننے والا ہے۔ دنیا بھر کی حکومتوں کے ساتھ ساتھ اقوام متحدہ، عالمی بینک اور دیگر عالمی اداروں کے لیے بھی افریقا غیر معمولی اہمیت کا حامل ہوتا جا رہا ہے۔ کل تک اِس خطے کو یکسر نظر انداز کر دیا جاتا تھا مگر اب ایسا نہیں ہے۔

اس وقت بہت سے متمول ممالک میں سیاست بنیادی طور پر اس حقیقت کے گرد گھومتی ہے کہ تارکینِ وطن کی آمد کو زیادہ سے زیادہ روکا جائے اور افرادی قوت سے متعلق مسائل خود حل کرنے کی بھرپور کوشش کی جائے۔ یورپ کی مجموعی کیفیت الگ تھلگ رہنے کی ہے۔ وہ تارکینِ وطن کی آمد روکنے کے حوالے سے غیر معمولی حد تک فعال ہے۔ یہ حقیقت بھی کسی طور جھٹلائی جا سکتی ہے نہ اِس سے صَرفِ نظر ہی ممکن ہے کہ یورپ سمیت دنیا بھر کے متمول ممالک میں ڈھلتی عمر والے افراد کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ پیدائش کی شرح بھی گر رہی ہے۔ اور چند کیسز میں تو آبادی گھٹتی ہوئی پائی گئی ہے۔ دوسری طرف افریقا کی آبادی تیزی سے بڑھ رہی ہے اور وہاں کام کرنے کی عمر کو پہنچنے والے افراد کی تعداد میں بھی تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔ افریقا سے جُڑے ہوئے متمول ممالک کے لیے یہ بہت بڑا چیلنج ہے، بالخصوص یورپ کے لیے۔

بہت جلد کام کا مستقبل افریقا کے مستقبل سے وابستہ ہو جائے گا کیونکہ افرادی قوت کا نمایاں حصہ وہاں سے آئے گا۔ معاشی طلب، موسمی تبدیلیاں، مناقشے، خانہ جنگیاں، عالمی سطح پر صحتِ عامہ کی کیفیت اور دوسرے بہت سے معاملات افریقا کے مستقبل سے جڑے ہوئے ہوں گے۔

اب یہ چیلنج درپیش ہے کہ افریقی ممالک کو کسی نہ کسی طور عالمی معیشت میں عمدگی سے کھپایا جائے تاکہ اس براعظم کے اداروں میں استحکام پیدا ہو، بالخصوص تعلیمی اداروں میں۔ اشیا سازی اور اعلیٰ درجے کی خدمات میں بھی افریقی ممالک کا حصہ بڑھانے کی اشد ضرورت ہے۔ اس کا متبادل یہ ہے کہ متمول ممالک ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں اور افریقا کی طرف سے آنے والے تارکینِ وطن کے ریلوں کا انتظار کریں۔ اس وقت بہتر امکانات کے لیے یورپ اور دیگر ترقی یافتہ خطوں اور ممالک کی طرف نقل مکانی کرنے والے افریقیوں کی تعداد زیادہ نہیں مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس تعداد میں اضافہ ہوتا جائے گا۔

اس وقت یہ بات بہت عجیب لگتی ہے کہ افریقا میں عالمی معیشت کا خاصا فعال حصہ بننے کی صلاحیت موجود ہے۔ مغربی دنیا نے ترقی کے حوالے سے جو بیانیہ دیا ہے، اُس کی

اندرونی صفحات پر:۔

- ترک ممالک کی کونسل
- ڈاکٹر عبدالقدیر خاں مرحوم
- مشرق وسطیٰ کا 'پیرس' لبنان تباہ کیسے ہوا؟
- مصر: ابھرتی ہوئی علاقائی طاقت
- شمال مشرقی شام کو نہیں بھولنا چاہیے
- سوڈان میں فوجی بغاوت کا اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا؟

روشنی میں تو یہ بہت عجیب ہی لگتا ہے مگر اِس کی بہتر تفہیم کے لیے وسطی افریقا کے کیس پر غور کیا جانا چاہیے کہ کس طور اُس نے ہماری جدید دنیا کی تشکیل و تطہیر میں اہم کردار ادا کیا۔ افریقا کئی صدیوں تک عالمی سیاست و معیشت میں خاصا فعال کردار ادا کرتا رہا ہے۔ اُن صدیوں کو بھی اب صدیاں بیت چکی ہیں۔ افریقا کی اِس تاریخ ہی نے مجھے "Born in Blackness: Africa, Africans, and the Making of the Modern World, 1471 to the Second World War." (''بورن اِن بلیکنیس: افریقا، افریقنز اینڈ دی میکنگ آف دی ماڈرن ورلڈ، ۱۴۷۱ء ٹو دی سیکنڈ ورلڈ وار'') لکھنے کی تحریک دی۔ یہ کہانی چودھویں صدی عیسوی میں شروع ہوتی ہے، جب مالی کے انتہائی مالدار حکمراں مانسا موسیٰ کو افسانوی شہرت حاصل ہوئی اور اُس کے قصوں کے ساتھ ساتھ مالی کے نقشے بھی یورپ میں گردش کرنے لگے۔ وہ مغربی افریقا کے وسط میں انتہائی غیر معمولی حیثیت کے ساتھ اقتدار کی ڈور تھامے ہوئے تھا۔ مالی کے نقشوں کی گردش ان اطلاعات کے بعد شروع ہوئی کہ مانسا موسیٰ نے ایک انتہائی شاندار قافلے کے ساتھ ساڑھے تین ہزار میل سے زیادہ کی مسافت طے کرتے ہوئے مکہ اور مدینہ میں حاضری دی تھی۔ یہ ۱۳۲۴ عیسوی کی بات ہے۔ اس قافلے میں کم و بیش ساٹھ ہزار افراد شامل تھے۔ راہ میں تقسیم کرنے کے لیے یہ لوگ اٹھارہ ٹن سونا لے کر روانہ ہوئے تھے۔

مانسا موسیٰ کی فقید المثال فیاضی نے ایک عشرے سے بھی زائد مدت تک یورپ اور لیونٹ کے خطے میں سونے کے نرخوں پر شدید دباؤ برقرار رکھا۔ ایک مصنف نے اِسے صدی کا سب سے بڑا واقعہ قرار دیا۔ اس واقعے نے یورپ کے لوگوں میں افریقی سونے کے حوالے سے تجسّس پیدا کیا اور یوں پرتگالیوں نے افریقی سونے کی تلاش کا سفر شروع کیا۔ بہت کوشش کے بعد گھانا میں سونے کا بہت بڑا ذخیرہ دریافت ہوا۔ پرتگالیوں نے وہاں ایک مضبوط تجارتی مرکز قائم کیا۔ بعد میں دوسرے مہم جو بھی بہت کچھ کرنے کے عزم کے ساتھ گھر سے نکلے اور اُنہیں بھی خاصی کامیابی ملی۔ ان میں الفونسو ڈی البوکرک اور بارٹولومیو ڈائس کے علاوہ کرسٹوفر کولمبس بھی شامل تھا جس نے کم و بیش دو عشروں کے بعد ہسپانیہ کی طرف سے امریکا کا سفر کیا۔

پرتگالیوں کو اچانک بہت بڑے پیمانے پر سونا حاصل ہوا تو ان کا چھوٹا سا ملک ہسپانیہ کی طرف سے کی جانے والی لشکر کشی کا سامنا کرنے کے قابل ہو سکا اور دنیا بھر میں سونے کی تلاش کے لیے کوششیں جاری رکھنے کے قابل ہو سکا۔ اس دوران یورپ میں دوسرے معاملات میں بھی پیش رفت ہوئی جو پورے خطے کی تقدیر بدلنے کا ذریعہ ثابت ہوئی۔ افریقا میں اچھی خاصی خوشحالی تھی۔ وہ بہت سی اشیا چاہتے تھے جو پرتگال بنانے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ سونے کی مدد سے پرتگالی افریقیوں کو مطلوب اشیا خرید کر وہاں پہنچاتے تھے۔ یوں اُن کی تجارت کا دائرہ وسعت اختیار کرتا گیا، اور پرتگالیوں کو یورپ بھر میں تجارتی نظام پھیلانے میں بھی مدد ملی۔ یورپ تب ترقی کے لیے ترس رہا تھا۔ خوشحالی بھی اس سے بہت دور تھی۔ ایسے میں پرتگالیوں نے کم و بیش پورے یورپ کو وہ سب کچھ دیا جس کی اسے سخت ضرورت تھی۔

یورپ نے ابتدا میں افریقیوں سے تجارتی روابط استوار کیے تھے مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ معاملات افریقیوں کو غلام بنا کر لانے تک جا پہنچا۔ یہ بدقسمتی کی بات تھی کیونکہ اس کے نتیجے میں یورپ اور افریقا کے درمیان پایا جانے والا معاشی تعلق تبدیل ہوا اور وہ بھرپور ترقی ممکن نہ بنائی جا سکی جو بنائی جا سکتی تھی۔ ایک کلیدی لمحہ تب آیا جب پرتگالیوں نے خطِ استوا کے خطے میں واقع غیر آباد جزیرے Sao Tome کو آباد کیا۔ انہوں نے افریقا سے لائے ہوئے غلاموں کی مدد سے وہاں گنے کی کاشت شروع کی۔ یہ سولہویں صدی عیسوی کی بات ہے۔ تب صاف ستھری، اعلیٰ درجے کی چینی یورپ میں ایک کمیاب شے تھی۔ یوں پرتگالیوں نے یورپ کے باشندوں کو تجارتی بنیاد پر شکر اور دوسری بہت سی اشیا تیار کرنے کی راہ پر گامزن کر کے جدید یورپ کی بنیاد ڈالنے میں کلیدی کردار ادا کیا۔ اس کے نتیجے میں وہاں ترقی اور خوشحالی کی راہ ہموار ہوئی یعنی یورپ نے تاریکیوں کو شکست دے کر اجالوں کو مقدر کیا۔ اس ماڈل کو ''چیٹل سلیوری'' کا نام دیا گیا۔

اس کے ساتھ ہی غلامی کا وہ دور بھی شروع ہوا، جس میں کسی ایک قوم یا نسل کے چند افراد بہت بڑی افرادی قوت پر حکومت کرتے تھے۔ اس ماڈل میں ترقی کا مدار خریدے ہوئے غلاموں کی محنت پر تھا۔ تاریخ میں اس نوعیت کے ماڈل کی مثالیں کم ہی تھیں۔ ایسے معاشرے کم ہی رہے ہیں جن میں پوری پوری نسلوں کو غلام بنا کر ماڈی ترقی و خوش حالی کی راہیں ہموار کی گئیں اور اُن محنت کرنے والوں کو برائے نام بھی معاوضہ نہیں دیا گیا۔ بعض مؤرخین نے ایسے معاشروں کی تعداد پانچ بتائی ہے، جو سب کے سب یورپی تھے یعنی قدیم یونان اور روم، برازیل کا نوآبادیاتی دور، جزائر غرب الہند کا خطہ اور نوآبادیاتی اور اُس کے بعد کے دور کا ریاست ہائے متحدہ امریکا کا جنوبی علاقہ۔ غلاموں کے ذریعے ترقی و خوشحالی یقینی بنانے کا یہ ماڈل نوآبادیاتی ساؤتھ سے بہت جلد نام نہاد ''نئی دنیا'' کو منتقل ہوا جہاں افریقی نسل کے غلاموں پر مبنی افرادی قوت آبادی کے تین چوتھائی سے زائد پر مشتمل ہوتی تھی۔ سفید فام لوگوں نے سیاہ فام لوگوں پر اندھا راج کیا اور غیر معمولی ماڈی ترقی کی راہ ہموار کی۔ سیاہ فام آبادی ایسی غلامی کی زد میں رہتی تھی، جس میں مرتے دم تک کام کرنا پڑتا تھا۔

مغربی معاشروں نے اپنی بھرپور ماڈی ترقی اور خوشحالی کو غلامی کی دین قرار دینے یا غلاموں کی محنت کو سب سے بڑا عامل تسلیم کرنے میں ہمیشہ ہچکچاہٹ کا اظہار کیا ہے اور کبھی کبھی تو معاملہ بہت ہی حیرت انگیز معلوم ہوتا ہے۔ ہر یورپی معاشرے نے اپنی بھرپور ترقی اور خوشحالی کو اپنی محنتِ شاقہ کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ غلامی کا ذکر حاشیوں میں بھی نہیں کیا جاتا۔ تاریخ شاہد ہے کہ جو کچھ تاریخ کے نام پر فاتحین لکھتے ہیں وہی تاریخ بنتا ہے اور اُسی کو مستند تسلیم کرنے کی روایت رہی ہے۔ سیاہ فام افریقی غلاموں کی محنتِ شاقہ کو مغربی معاشروں نے یا تو بالکل ہی قابلِ ذکر نہیں سمجھا یا پھر انتہائی سرسری انداز سے اِس کا ذکر کیا ہے۔

خیر، غلامی کے زمانے میں افریقا اور اُس کے باشندوں نے پوری دنیا کی ترقی و خوش حالی یقینی بنانے میں جو کردار ادا کیا وہ کسی بھی طور ایسا نہیں کہ نظر انداز کیا جائے یا بھلا دیا جائے۔ چند مؤرخین نے اندازہ لگایا ہے کہ سیاہ فام غلاموں نے شدید جبر کے تحت کم و بیش ڈھائی ارب گھنٹے محنت کی۔ یہ محنت نئی دنیا کے کھیتوں میں کی گئی۔ اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی دولت یورپی باشندوں کے اُس سونے اور چاندی سے زیادہ تھی، جو وہ شمالی اور جنوبی امریکا سے لائے تھے۔ شمالی امریکا میں برطانیہ کے نوآبادیاتی علاقے نسبتاً غریب تھے اور انہیں اپنی گزر بسر کے لیے کیریبین کے خطے کے غلام جزائر سے تجارت کرنا پڑتی تھی۔ اٹھارہویں صدی میں موجودہ ہیٹی کے خطے میں موجود نوآبادیاتی علاقے میں غلاموں سے حاصل ہونے والی دولت فرانس کی ایک تہائی بیرونی تجارت کے مساوی تھی اور یہی فرانس کی بے مثالی ترقی کا سب سے اہم عامل تھا۔

یورپی نسلوں سے تعلق رکھنے والے بیشتر افراد اس تاریخ سے بہت حد تک ناواقف ہیں۔ جو افریقیوں کی تاریخ ہے، وہ بہت حد تک اِن سفید فام باشندوں کی بھی تاریخ ہے۔

ایک زمانے تک سیاہ فام باشندوں کو غلام بنا کر اُن سے شدید غیر انسانی رویّوں کے ساتھ کرائی گئی محنت کو غلط تسلیم کرنے کی روایت ہی پیدا نہیں ہوئی۔ اب اس تلخ حقیقت کو تسلیم کیا جارہا ہے۔ ہمارے عہد کے ایک معروف انگریز دانشور Malachy Postlethwayt نے لکھا ہے کہ انگلینڈ کی بھرپور ترقی و خوشحالی میں نمایاں ترین کردار سیاہ فام غلاموں کی محنت نے ادا کیا۔ مغرب کے بہت سے باشندوں کے ذہنوں میں اب بھی تذبذب اور خلفشار پایا جاتا ہے۔ بعض سفید فام مغربی باشندوں کا یہ اعتراض ہے کہ اگر یورپی باشندوں نے افریقیوں کو خرید کر غلام بنایا تھا تو انہیں اُن کے اپنے لوگوں نے بیچا کیوں تھا۔ میں نے اس نکتے پر غور کیا۔ ایسا ہی تھا۔ کچھ لوگوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ یورپ والوں نے تو اپنے باشندوں کو کبھی غلام کی حیثیت سے کام کرنے کے لیے فروخت نہیں کیا۔ ایسا نہیں ہے۔ سفید فام یورپی باشندوں کو بھی غلام کی حیثیت سے فروخت کیا گیا! اور یہ سلسلہ صدیوں چلا۔ کبھی آپ نے لفظ Slavic پر غور کیا ہے؟ میں اس سلسلے میں تجویز پیش کروں گا کہ معروف برطانوی مورخ پیٹر فرینکوپان کی کتاب ''دی سلک روڈز: اے نیو ہسٹری آف دی ورلڈ'' پڑھیں۔ یورپ میں کئی صدیوں تک کئی معاشرے سفید فام غلاموں کی خرید و فروخت میں مصروف و ملوث رہے۔

کچھ لوگ اس نکتے پر بھی معترض ہیں کہ سیاہ فام غلاموں کے سفید فام تاجروں کے بارے میں تو بہت کچھ لکھا جاتا ہے مگر غلاموں کی تجارت کرنے والے سیاہ فام تاجروں کے حوالے سے کوئی بات نہیں کی جاتی۔ اور پھر یہ سوال بھی اٹھایا جاتا ہے کہ اب یہ گڑا مُردہ کیوں اکھاڑا جارہا ہے۔ کیا کتابیں بیچنے کے لیے؟ یا نسلوں کے درمیان اختلاف و انتشار پھیلانے کے لیے؟ میں نے اپنی کتاب میں یہ بتانے کی بھی کوشش کی ہے کہ افریقا میں رہنے والے افریقیوں کی کوئی واحد نسلی شناخت نہیں تھی۔ جس دنیا میں سبھی سیاہ فام ہوں وہاں سیاہ فام ہونا کوئی قابلِ ذکر چیز نہیں۔

مزید برآں، جو افریقی باشندے غلاموں کی خرید و فروخت میں ملوث تھے انہیں کچھ بھی اندازہ نہ تھا کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے اور دیگر معاشروں کی طرح افریقی معاشرے بھی اندرونی سطح پر غلاموں کی خرید و فروخت کو ایک عمومی چلن کے طور پر اپنائے ہوئے تھے، اس لیے انہیں کچھ اندازہ نہ تھا کہ یورپ میں چیتل سلیوری نام کا بھی کوئی چلن ہے۔ بیشتر افریقی معاشروں میں غلاموں کو رفتہ رفتہ مالک کے خاندان کا حصہ بنالیا جاتا تھا اور پھر وہ بھول بھال جاتے تھے کہ وہ کبھی غلام تھے۔ وہ اپنے آبا تک کو بھول جاتے تھے۔ یہ بھی کوئی حیرت انگیز بات نہ تھی کہ غلاموں کی اولاد میں سے کوئی قبیلہ و برادری کا سربراہ اور بعض حالات میں ملک کا بادشاہ بھی بن جاتا تھا!

یورپی نسل کے لوگ اس تاریخ سے بہت حد تک ناواقف ہیں۔ بہت کم لوگوں کو یہ معلوم ہے کہ ۱۸۲۰ء تک بحرِ اوقیانوس میں جتنے باشندے رضا کارانہ طور پر سفر کرتے تھے اُن سے چار گنا سیاہ فام غلام امریکا لائے جاتے تھے۔ عورتوں میں یہ نسبت زیادہ وسیع تھی۔ تاریخ کے ریکارڈ کی بنیاد پر ہمیں سفید فام نسلوں کی تعلیم، تفریحِ طبع، شجاعت، اعلیٰ ظرفی اور دوسرے بہت سے اوصاف کے بارے میں بہت کچھ بتایا جاتا تھا۔ کسی اور نسل کا ذکر تک نہیں ملتا۔

''فاکس نیوز'' کے ٹکر کارلسن نے بڑے فخر سے کہا تھا کہ شمالی و جنوبی امریکا کو سفید فام باشندوں نے تعمیر کیا تھا۔ آج ساری دنیا کو یہی بتایا جاتا ہے کہ مغرب دراصل مغربی یورپ اور شمالی امریکا میں یورپی باشندوں کے آباد کیے ہوئے علاقوں پر مبنی ہے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ افریقیوں کو کسی بھی حال میں بھلایا نہیں جاسکتا۔ جن کی محنت نے امریکی نوآبادیوں کو یورپی باشندوں کے لیے زیادہ سے زیادہ منفعت بخش بنایا اُن کا کوئی ذکر ہی نہیں کر رہا۔ انہوں نے نئی دنیا کی دولت کا سب سے بڑا حصہ پیدا کیا۔ ان کی محنت نے یورپی باشندوں کو جسمانی مشقت سے نجات دلائی اور وہ بھرپور تعلیم و تربیت کے ذریعے فطری علوم و فنون کے شعبوں میں کچھ کرنے کے قابل ہوسکے۔ اس کے نتیجے میں یورپی ثقافت کو پھلنے پھولنے کا موقع ملا۔ یہ افریقیوں کی قربانیاں ہی تھیں جنہوں نے مغرب کو فقید المثال ترقی سے ہم کنار ہونے کا موقع فراہم کیا۔

افریقی غلاموں نے گنّے اور کپاس کی غیر معمولی پیداوار یقینی بنا کر صنعتی دور شروع کرنے میں مدد دی۔ پھر یہی محنت بڑے پیمانے کی بینکاری، مالیاتی خدمات اور انشورنس کے اداروں کے قیام کی بنیاد ثابت ہوئی۔ یوں کاروباری نظم و نسق کا وہ دور شروع ہوا جس نے پوری دنیا میں کاروباری اور مالیاتی نظام کو بدل کر رکھ دیا۔ سیاہ فام غلاموں کی پیدا کردہ شکر، کافی، تمباکو اور کپاس نے یورپ کا رہن سہن تبدیل کر دیا۔ سترہویں صدی کے دوران یورپ میں کافی ہاؤس عام ہوئے۔ کافی ہاؤس یا کافی شاپس میں لوگوں کے مل بیٹھنے کی گنجائش پیدا ہوئی اور یوں تبادلۂ خیالات کے نتیجے میں جمہوریت کی بنیاد پڑی۔ اخبارات کی اشاعت بھی اصلاً کافی شاپس میں مل بیٹھنے والوں کے لیے تھی اور اخبارات کی اشاعت کا دائرہ وسیع کرنے میں اُنہی لوگوں نے کلیدی کردار ادا کیا۔ اِس دوران ہیٹی کے لوگوں نے فرانس سے آزادی کی خاطر جنگ لڑی اور انسان کی پیدائشی آبادی کے تصور کو پروان چڑھانے میں بنیادی کردار ادا کیا۔ اُن کی اولاد یہ جنگ امریکی سرزمین تک لائی۔ امریکی انقلاب میں انہوں نے آزادی کی جنگ لڑی اور خانہ جنگی جیتنے میں فیصلہ کن کردار ادا کیا۔

جدت اور جدیدیت کی ہماری تاریخ میں افریقا اور افریقی ہمیشہ جزوِ لاینفک کے طور پر رہے ہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ فاتحین ہمیشہ صرف اپنے گُن گاتے ہیں اور دوسروں کے کسی بھی مثبت کردار کو تسلیم کرنے کے لیے نہیں ہوتے۔ ہم دنیا کی نظر میں فاتح رہے ہیں، اس لیے صرف اپنی بات کرتے ہیں اور افریقیوں کی قربانیوں کو یکسر نظر انداز کر دیتے ہیں۔ افریقا جس طور دنیا کے ماضی کے لیے اہم تھا بالکل اُسی طور اس کے مستقبل کے لیے بھی بہت اہم ہوگا۔ ہم جب تک حقیقت سے رُوگردانی کرتے رہیں گے اور افریقا کے معاملے میں بے حسی کا مظاہرہ کرتے رہیں گے تب تک غلطیوں کا اعادہ ہوتا رہے گا اور خرابیوں کا سلسلہ جاری رہے گا۔

(ترجمہ: محمد ابراہیم خان)

"Africa is central to the modern world's future—and its Past".

("worldpoliticsreview.com". Oct. 27, 2021)

بقیہ: مشرقِ وسطیٰ کا 'پیرس' لبنان تباہ کیسے ہوا؟

میں پیدا ہونے والی غیر یقینی اور معاشی پالیسی کے ٹھہراؤ نے عرب دنیا اور اسلامی دنیا کے لیے امید کی کرن رہنے والے معاشرے اور معیشت کو تباہ و برباد کر دیا۔

پاکستانی پالیسی ساز شدید معاشی چیلنجوں سے نمٹنے کی کوشش کر رہے ہیں اور اس پس منظر میں لبنان کی اس افسوسناک کہانی میں کئی سبق موجود ہیں۔ شاید ان میں سے سب سے اہم سبق یہ ہے کہ سیاسی رسہ کشی، پالیسیوں میں آنے والا ڈیڈ لاک اور رشوت، کامیاب ترین اقوام کو بھی ختم کر دیتی ہے۔

(بحوالہ: روزنامہ ''ڈان'' کراچی۔ ۱۹ نومبر ۲۰۲۱ء)

ترک ممالک کی کونسل۔ ایک نئے ورلڈ آرڈر کی نوید

افتخار گیلانی

ترکی کے شہر استنبول میں پچھلے ہفتے ترک زبان بولنے والے ممالک کی تنظیم ترک کونسل کے سربراہان کے اجلاس کے دوران اس تنظیم کو عرب لیگ کی طرز پر باضابطہ ایک سیاسی فورم کی شکل دی گئی۔ اجلاس کے اختتام پر بتایا گیا کہ ترک کونسل کا نام تبدیل کرکے ترک ریاستوں کی تنظیم رکھ کر اس کو مزید فعال بنا کر تعلقات کو مزید مضبوط اور نئی راہداریاں قائم کرکے اشتراک کی نئی راہیں ڈھونڈی جائیں گی۔ ترک وزیر خارجہ حیولت چاوش اوغلو نے کہا کہ کونسل ایک تبدیلی کے منصوبے سے گزر رہی ہے اور عالمی سیاست میں ایشیا کے عروج کے تناظر میں یہ تنظیم، جس میں ترکی کے علاوہ آذربائیجان، قزاقستان، کرغزستان، ازبکستان باضابطہ رُکن ہیں، ایک اہم کردار ادا کریں گے۔ ہنگری اور ترکمانستان کو اس تنظیم میں مبصر کا درجہ حاصل ہے۔ گو کہ ترکمانستان بھی کلی طور پر ترک زبان بولنے والا ملک ہے، مگر ایک پالیسی کے تحت یہ کسی بین الاقوامی فورم کا ممبر بننے سے احتراز کرتا ہے۔ اس فورم میں یوکرائن اور افغانستان کی ممبرشپ پر جلد ہی فیصلہ کیا جائے گا۔ کابل پر طالبان کے قبضہ سے بس چند ماہ قبل ہی سابق اشرف غنی حکومت نے ترک کونسل کی ممبرشپ کی درخواست جمع کروائی تھی۔

ترک کونسل اکتوبر ۲۰۰۹ء میں ترکی، آذربائیجان، قازقستان اور کرغزستان کے نخچیوان معاہدے پر دستخط کرنے کے بعد قائم ہوئی تھی، تاکہ ترک زبان بولنے والے ممالک کے درمیان گہرے تعلقات اور یکجہتی کو فروغ دے کر، یوریشیائی براعظم بالخصوص وسطی ایشیا اور قفقاز میں تعاون کی راہیں تلاش کی جائیں۔ مگر آذربائیجان اور آرمینیا کے درمیان کشیدہ تعلقات اور نگورنو کاراباخ پر آرمینیا کے قبضہ کے بعد ترکی اور آذربائیجان کے لیے راہداری تک رسائی بند ہوگئی تھی۔ اس کی وجہ سے ترکی اور آذربائیجان دیگر ترک زبان بولنے والے وسط ایشیائی ممالک سے کٹ گئے تھے۔ پچھلے سال آرمینیا کو جنگ میں ہرانے اور نگورنو کاراباخ پر قبضے کے بعد آذربائیجان نے نخچیوان یا زنگذور راہداری پر رسائی حاصل کرکے ترک دنیا کو ایک بار پھر جوڑنے کا کام کر دیا ہے۔ ترکی نے تو پہلے ہی نخچیوان تک ۲۷۰ ملین ڈالر کی لاگت سے ۲۳۰ کلومیٹر طویل ریلوے لائن بچھانے کا اعلان کیا ہے۔ اس لائن کو بعد میں آذربائیجان، ایران کے راستے افغانستان اور پاکستان تک وسعت دی جائے گی۔ چاوش اوغلو نے زور دیا کہ تمام ترک بولنے والے لوگ ایک درخت کی ''شاخیں'' ہیں۔ انہوں نے ترک کونسل کو ''خاندانی کونسل'' کہا۔ ان کا کہنا تھا ان ممالک کی جڑیں مشترک ہیں، اس لیے ان کو مستقبل کے حوالے سے مشترکہ نقطہ نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔ استنبول میں ۲۰۴۰ء کے جس وژن پر اتفاق رائے پایا گیا اس میں یورپی یونین کی طرز پر ایک مضبوط و مشترکہ خارجہ پالیسی اپنانے کے ساتھ ساتھ، سیکورٹی تعاون، آزادانہ تجارت پر عمل درآمد، نقل وحمل کے لیے سرحدیں کھولنا اور رکن ممالک کے درمیان مضبوط تعاون کی راہیں تلاش کرنا شامل ہے۔

امریکی تھنک ٹینک سینٹر فار نیول انالیسس میں وسطی ایشیائی امور کی ماہر عمیدہ ہاشموف کے مطابق یہ فورم کئی اقتصادی منصوبوں کا محور ثابت ہوگی اور یورپی یونین کی طرح یہ جلد ہی اقتصادی اور سیاسی اثر ورسوخ حاصل کرکے ایک طاقتور بین الاقوامی فورم کی شکل میں ابھرے گی۔ عالمی جریدے کونسل آن فارن ریلیشنز کے مطابق آذربائیجان کے تیل اور گیس کو یورپ پہنچانے کے لیے دو راستے ہیں، ایک شمال مغربی روس اور دوسرا جنوب مغربی قفقاز یا کاکیشیائی ریاستوں سے ہوکر ترکی سے گزرتا ہے۔ یورپ اپنی گیس کی ضروریات کو یہاں سے پورا کرنے کے لیے مستقبل میں یہاں سے مزید پائپ لائنوں کی تعمیر کا خواہشمند ہے۔ ترک صدر رجب طیب ایردوان نے خاص طور پر اس میٹنگ میں ٹرانس کیسپین ایسٹ ویسٹ، مڈل کوریڈور کے بارے میں بات کی، جو جارجیا، آذربائیجان اور بحیرہ کیسپین سے ہوتا ہوا مستقبل میں ترکمانستان، ازبکستان، کرغزستان کے راستے پر چین کو جوڑے گا۔ یہ راہداری موجودہ ایشیا، یورپ ٹرانس سائبیرین ریل روڈ کا بہتر اور تیز ترین متبادل پیش کرے گی۔ ازبکستان کے صدر شوکت مرزیویف نے کہا کہ ان کے ملک کے لیے نقل وحمل اور ٹرانزٹ صلاحیت کو بڑھانا حکمت عملی کے لحاظ سے اہم ہے۔ ''وسطی ایشیا کے راستے اہم عالمی منڈیوں بشمول چین، بھارت اور پاکستان اور دیگر ایشیائی ممالک کے ساتھ ساتھ آذربائیجان اور ترکی سے یورپی ممالک تک رسائی کو یقینی بنانا بہت ضروری ہے۔ ان سمتوں میں ٹرانسپورٹ کوریڈورز کی ترقی اور لاجسٹک انفراسٹرکچر بنانے کے لیے بڑے پروجیکٹوں کی مشترکہ تکمیل میں ہمارے مشترکہ مفادات ہیں۔'' ایک اندازہ کے مطابق دنیا میں اس وقت ۱۸۰ ملین افراد کی زبان ترک ہے۔ نیز ۲۰۰ ملین افراد کے لیے یہ متبادل زبان ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ نصف ترک زبان بولنے والے روس اور سابق سوویت یونین پر مشتمل علاقوں میں آباد ہیں۔ سابق سوویت یونین کے ۱۵ صوبوں میں تقریباً ۴۰ قومیتیں ترک زبانیں بولتی تھیں۔

روس میں تاتارستان، بشکرستان، نیز تو فالار، خاکس، شور، چلم ترک، سائبیرین تاتار، الٹیائیز، ٹیلنگنس، ٹیلیوٹس، توبالر، چاکان، کماندی، ارمس اور ایران کی سرحد پر چواش قومیں ترک زبان بولتی ہیں۔ روسی اکیڈمی آف سائنسز کے لسانیات کے انسٹی ٹیوٹ میں کام کرنے والی انا ڈیپو کا کہنا ہے کہ ترک زبان بولنے والے ترکی سے لے کر چین تک اور یہاں تک کہ بحر آرکٹک سے لے کر ایران تک زمین کے ایک بڑے حصے میں آباد ہیں۔ حتیٰ کہ جموں وکشمیر کا دور افتادہ اور پسماندہ لداخ خطہ، جہاں اس وقت چینی اور بھارتی فوج برسرپیکار ہے، ایک صدی قبل تک دنیا سے اس قدر جڑا تھا، کہ ترکی یہاں کی دوسری زبان تھی۔ تاجروں، سیاحوں، جاسوسوں اور سپاہیوں کے لیے ترکستان یعنی سنکیانگ کے شہروں یارقند، خوتان اور کاشغر کے سفر کے لیے لداخ ایک اہم زمینی رابطہ تھا۔ سرحدوں میں تبدیلی اور لوگوں کے درمیان رابطے کے کمزور ہونے کے ساتھ، ترک زبانوں نے مختلف لہجے اور بولیاں جمع کیں اور آہستہ آہستہ وہ اصل زبان سے الگ ہوگئے۔ وقت کا تقاضا ہے کہ یہ تنظیم اس زبان کا ایک معیار تیار کرکے اس کو سبھی ممالک میں نافذ بھی کروائے۔ ماہرین کے مطابق گو کہ مختلف قومیتوں کے لوگ ترک زبانوں کے مختلف ورژن بولتے ہیں، اور عربی کے برعکس ان کے رسم الخط بھی جدا ہیں، لیکن وہ ایک دوسرے کو سمجھ سکتے ہیں۔ زبان کا بندھن ان کے درمیان فاصلوں کو ختم کرتا ہے اور ان کے درمیان اعتماد پیدا کرنے کے لیے ان کی بات چیت کو آسان بناتا ہے۔ ترک ریاستوں کی تنظیم کے سیکرٹری جنرل بغداد

باقی صفحہ نمبر ۷

ڈاکٹر عبدالقدیر خاں مرحوم

پروفیسر خورشید احمد

اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ زندگی میں انسان بہت سے اُتار چڑھاؤ، صدمات اور خوشیوں کو قریب سے دیکھتا اور برداشت کرتا ہے۔ لیکن بعض واقعات اور حوادث اس قدر گہرے اور دُوررس اثرات کے حامل ہوتے ہیں کہ حیرت اور صدمے کے الفاظ ان کا احاطہ نہیں کرسکتے۔ اس کیفیت میں بالخصوص اپنے دوستوں، رفیقوں اور محترم شخصیتوں کی جدائی بہت اذیت ناک ہوتی ہے۔

۱۰ر اکتوبر ۲۰۲۱ء کو پاکستان کے مایہ ناز سائنس دان جناب عبدالقدیر خاں کا انتقال ہوا تو لوحِ ذہن پر واقعات و حوادث کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ اُبھر آیا۔

یہ ۱۹۵۲ء کی بات ہے، جب میں اسلامی جمعیت طلبہ کراچی کا ناظم تھا۔ تب، کھوکھراپار کے راستے، بے سروسامانی کے عالم میں بھوپال سے ہجرت کرکے آنے والے ایک دراز قامت طالب علم سے ملاقات ہوئی۔ جس کی شرافت، نجابت اور شائستگی کا نقش پہلی ملاقات ہی میں ثبت ہوگیا۔ یہ نوجوان طالب علم ڈی جے سائنس کالج میں ایف ایس سی میں زیرتعلیم تھا اور والدین و اساتذہ کی دینی تربیت کے باعث، جمعیت کے رفقا سے قریب تر ہوگیا۔ آگے چل کر یہی نوجوان ڈاکٹر اے کیو خاں کے نام سے پاکستان کے جوہری پروگرام کا سرتاج بنا۔

اُس زمانے میں عبدالقدیر خاں کی وابستگی جمعیت کے اجتماعات میں شرکت، ہمارے ترجمان Student's Voice کی اشاعت و ترویج، مستحق طالب علموں کی تعلیمی مدد اور سماجی سرگرمیوں میں ہم قدم ہونے تک تھی۔ اسی دوران ایک روز انھوں نے مجھ سے کہا: ''میں جمعیت کا رُکن بننا چاہتا ہوں''۔ میں نے اُن کے ذوقِ مطالعہ کو جانچنے کے باوجود یہ کہا کہ ''نصاب رکنیت کی مزید کتب کا مطالعہ کرلیجیے''۔ تاہم، بعد میں وہ تنظیم میں اور زیادہ آگے نہیں بڑھ سکے، لیکن جمعیت کی اجتماعی سرگرمیوں سے اپنے زمانۂ طالب علمی میں وابستہ رہے۔ تعلیم مکمل کرکے پہلے مقامی طور پر کراچی میں ملازمت کی اور بعد میں بیرونِ پاکستان چلے گئے۔

ڈاکٹر عبدالقدیر خاں کے احوالِ زندگی پر بہت کچھ لکھا گیا ہے اور لکھا جاتا رہے گا۔ لیکن یہاں میں ان کے بارے میں ان کی زندگی کے چند ایسے اوراق پیش کرنا چاہتا ہوں، جو لکھنے والوں کی نظروں سے بالعموم اوجھل رہے ہیں۔ جنرل پرویز مشرف کے دورِ حکومت میں سب سے پہلے ۲۰۰۱ء میں ڈاکٹر صاحب کو ایٹمی پروگرام سے متعلق قومی ادارے KRL کی سربراہی سے سبک دوش کرکے صدر کا مشیر مقرر کیا گیا۔ مگر ۳۱ جنوری ۲۰۰۴ء کو انھیں اچانک اس منصب سے الگ کرکے نظربند کردیا گیا، حتیٰ کہ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ انھیں امریکا کے حوالے کیے جانے کی باتیں منظرعام پر آئیں۔

ڈاکٹر صاحب کو نظربند کرنے کے بعد، ان کے خلاف کردارکشی کی مہم چلائی گئی۔ ایسا کیوں ہوا؟ اور کیسے ہوا؟ چونکہ یہ معاملہ بہت نازک ہے، اس لیے اپنی روایت سے ہٹ کر، سینیٹ آف پاکستان میں اپنی چند تقریروں کے اقتباسات، سینیٹ کے ریکارڈ سے پیش کررہا ہوں، جن سے معاملے کی نزاکت کی تفہیم ممکن ہوسکے گی۔

۱۶ر فروری ۲۰۰۴ء کو سینیٹ میں تقریر کرتے ہوئے میں نے کہا تھا: ''یہ معاملہ محض چار فروری (۲۰۰۴ء) کو ڈاکٹر اے کیو خان کے ٹیلی وژن پر 'اعترافی بیان' کے عمل تک محدود نہیں ہے۔ آپ یہ دیکھیے کہ کس طرح ۲۰۰۱ء میں ڈاکٹر اے کیو خان کو ان کے منصب سے فارغ کرکے صرف مشیر کی نمائشی حیثیت دی گئی۔ تب یہ پہلا اشارہ تھا کہ ہوا کا رُخ کیا ہے۔ درحقیقت نائن الیون کی مناسبت سے معاملہ صرف یہی نہیں ہوا کہ اس کے چند روز بعد ہم نے اپنے ایئرپورٹ، زمینیں اور فضائیں امریکا کے لیے کھول دی تھیں بلکہ ہم نے امریکا کو موقع دیا تھا کہ ہماری ایٹمی صلاحیت کے بارے میں وہ جو کچھ ہم سے کہلوانا چاہتا ہے یا جہاں لے جانا چاہتا ہے، اس کے لیے ہم پر دباؤ ڈال سکے۔

یہ سب کچھ اچانک نہیں ہوا۔ اس سے قبل 'ڈی بریفنگ' (De-briefing) کا معاملہ شروع کیا گیا تھا۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے ڈی بریفنگ صرف جاسوسوں کی ہوتی ہے لیکن ہم نے اس اصطلاح کو اپنے ان محسنوں کے لیے استعمال کیا ہے، جو اس ملک کی سلامتی و خودمختاری اور اس کے دفاع کو مؤثر بنانے کے لیے ہر قیمت پر قربانی دیتے ہیں۔ پھر 'ڈی بریفنگ' کے اس نام نہاد عمل کو بھی ہم نے بالاقساط کیا۔ پہلے تو دو سائنس دانوں کو اُٹھایا اور کہا کہ ''اے کیو خان کی طرف کوئی میلی آنکھ سے نہیں دیکھ سکتا''۔ لیکن پھر جس شخص نے اس ملک پر سب سے بڑا احسان کیا اور جس نے اس کے لیے بڑی قربانیاں دیں، اس کو تسلسل سے تضحیک کا نشانہ بنایا گیا۔

یہ سارے اقدامات نہایت ہی اہانت اور ذلت آمیز طریقے سے کیے گئے۔ یہ مسئلہ اپوزیشن یا محض حکومت کا بھی نہیں ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ حکومت، فوج، پارلیمنٹ ہم سب کا مشترک معاملہ ہے۔ اس ملک کا تحفظ اور اس کی ایٹمی دفاعی صلاحیت کا تحفظ ہی نہیں اس صلاحیت کی ترقی بھی ہمارا مشترکہ ایجنڈا ہے۔ اس لیے کہ دفاعی صلاحیت ایک منجمد نہیں بلکہ متحرک تصور ہے۔ اس پر حالات کی مناسبت سے نظرثانی کرنی پڑتی ہے، وقتاً فوقتاً جائزہ لیتے ہوئے اس کے لیے تحقیق و ترقی کا انتظام ناگزیر اور ضروری ہے۔ ظاہر ہے اس کے لیے سائنس دانوں کا تعاون اور ضروری وسائل کی فراہمی اور وہ تمام طریقے اختیار کرنا ضروری ہیں، جو دُنیا کی پابندیوں کے باوجود ہم نے اپنی آزادی، خودمختاری اور سلامتی کے تحفظ کے لیے ماضی میں بھی کیے ہیں اور آئندہ بھی کرنے پڑیں گے۔

یہ بڑی زیادتی اور بڑا ظلم ہے، جو آپ ان محترم سائنس دان کے ساتھ کررہے ہیں۔ جو شخص باہر کی ایک بڑی تنخواہ چھوڑ کر اور اپنی زندگی کو خطرے میں ڈال کر، اپنے ملک کو بچانے کے لیے آیا، وہ بلاشبہ سائنس دانوں اور انجینئروں کی ایک ٹیم کا حصہ ہے۔ اس ٹیم میں جو جوہری قائد تھے، ان کا نام ڈاکٹر اے کیو خان ہے۔ اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا۔ آپ ایک طرف اس کے منہ پر طمانچہ مارتے ہیں اور دوسری طرف کہتے ہیں کہ یہ میرا 'ہیرو' ہے۔ یہ کون سا طریقہ ہے؟

میں متنبہ کرنا چاہتا ہوں کہ ان اقدامات کے نتیجے میں فوجی قیادت اور عوام کے درمیان بے اعتمادی بڑھ رہی ہے۔ اے کیو خان اور ان کے ساتھی سائنس دان قوم کے ہیرو اور محسن ہیں۔ آج تک وژن یہ تھا کہ سائنس دان، اے کیو خان اور فوجی قیادت ساتھ ساتھ ہیں اور سب احترام کی نظر سے دیکھے جارہے تھے لیکن آج آپ نے ان کے درمیان ایک تصادم پیدا کرکے پوری قوم کے سامنے اس وژن کو منتشر کردیا ہے۔

۲۹ر اکتوبر ۲۰۰۴ء کو سینیٹ میں تقریر کرتے ہوئے میں نے کہا: ''۲۸ر اکتوبر ۲۰۰۴ء کے روزنامہ پاکستان آبزرور، [اسلام آباد] میں ڈاکٹر اے کیو خان پر فالج کے حملے کی بڑی

پریشان کن خبر شائع ہوئی ہے اور جو تفصیلات ہمارے سامنے آئی ہیں، وہ یہ ہیں کہ عظیم ایٹمی سائنس دان ڈاکٹر اے کیو خان متعدد خطرناک بیماریوں میں مبتلا ہیں اور گذشتہ سات ماہ سے اپنے گھر پر نظر بند ہیں۔ انتہائی ہائی بلڈ پریشر اور شدید ذہنی دباؤ کا شکار ہیں اور ان کا ۳۴ پونڈ وزن کم ہوگیا ہے۔

ڈاکٹر عبدالقدیر خاں ایک قومی اثاثہ اور ہمارے محسن ہیں۔ میں اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتا کہ ان پر کیا الزامات لگائے گئے ہیں اور ان الزامات کی حقیقت یا پس منظر کیا ہے اور کون کیا کھیل کھیل رہا ہے؟ اس وقت میں اس بات پر زور دینا چاہتا ہوں کہ وہ ہمارا ایک بہت بڑا قومی اثاثہ ہیں اور اس کو اس طریقے سے نظر بند رکھنا اور معقول علاج معالجے کی سہولتیں نہ دینا، ایک قومی جرم ہوگا۔ اس لیے دردمندی کے ساتھ کہنا چاہتا ہوں کہ ہم یہ مسئلہ پارٹی سیاست سے بالاتر ہوکر اُٹھائیں۔ بلکہ یہ کہوں گا کہ اسے پوری اُمت مسلمہ کے ایک مسئلے کے طور پر لیں، اس لیے کہ ڈاکٹر خان صرف پاکستان کا نہیں پوری اُمت مسلمہ کا اثاثہ ہیں۔

ماضی میں جو کچھ ہوا، وہ اپنی جگہ، لیکن ان کی جان بچانا، ان کو مناسب سہولتیں دینا، اور حبس اور گھٹن کی کیفیت سے نکالنا جس میں وہ گرفتار ہیں، ہماری ذمہ داری ہے۔ میں متوجہ کرنا چاہتا ہوں کہ حکومت اس معاملے کو سنجیدگی سے لے اور قوم کے جذبات کا احترام کرے۔ بیرونی حکومتوں کے اپنے مفادات ہیں۔ جوہری افزودگی کے حوالے سے کس کس نے کیا کیا ہے، یہ آپ کو معلوم ہے۔ اب تو یہ بات بھی سامنے آگئی ہے کہ بھارت اس میں ملوث ہے۔ دوسری جانب آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ جنوبی کوریا اپنے وسائل سے اس کام کو کر رہا ہے لیکن ایک خاص اسکینڈل کے ذریعے جنوبی کوریا کے ساتھ ہمیں ملوث کیا جارہا ہے۔ تاہم، میں مطالبہ کروں گا کہ حکومت اس ایوان میں ہمارے سامنے سارے حقائق رکھے۔

۱۲ مئی ۲۰۰۶ء کو سینیٹ میں مَیں نے یہ بیان دیا: ''میں ایک نہایت ہی اہم قومی مسئلے کے بارے میں آپ کی توجہ دلانا چاہتا ہوں۔ اس مسئلے کا تعلق پاکستان اور اُمتِ مسلمہ کے محسن ڈاکٹر اے کیو خان سے ہے۔ اس سلسلے میں ان کو بار بار کی تفتیش، تذلیل اور سیکورٹی کے نام پر ان کے سماجی، خاندانی تعلقات، ان کی ملاقاتیں، حتیٰ کہ اپنی اولاد اور ان کی نواسیوں تک سے ملاقات کو روکا جارہا ہے۔ پھر یہ اطلاع آئی کہ ان کو دھمکایا گیا ہے کہ آپ کو قید تنہائی میں ڈال دیا جائے گا اور پھر گیسٹ ہاؤس کے گیٹ کے پاس، ایک کمرہ خصوصیت سے اس طرح سے بنایا گیا کہ وہ کسی جیل خانہ سے کم نہیں۔ وہاں وہ اپنی بیوی کے ساتھ بھی نہیں رہ سکتے۔ یہ ساری چیزیں ہو رہی تھیں کہ پھر یہ اطلاع آئی کہ ان کو اسپتال لے جایا گیا ہے۔

حکومتی ترجمان نے کہا ہے کہ ''ہم نے ڈاکٹر اے کیو خان کی رہائش کے باہر جو مشین لگائی ہے یہ ان کی حفاظت کے لیے ہے'' اور یہ کہ ''ان سے ملنے کے لیے کوئی نہیں آسکتا''۔ مزید یہ کہ ''بیوی اور شوہر وہاں رہ رہے ہیں اور ان سے صرف ان کی بیٹی مل سکتی ہے''۔ سوال یہ ہے کہ نواسی کو کیوں نہیں آنے دیا جاتا۔ کیا وہ اپنے نانا کو مارنے کے لیے کوئی اسلحہ، کوئی ہتھیار لائے گی؟ چلیے میں سیکورٹی کے لیے نگرانی کے ایک نظام کی ضرورت مان لیتا ہوں، لیکن مسئلہ ہے ملاقاتوں سے منع کرنے کا، ذہنی اذیت اور قید تنہائی کا اور طرح طرح کی ان دھمکیوں کا جو ڈاکٹر صاحب کو دی جارہی ہیں۔

یہاں آپ کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ جناب جنرل پرویز مشرف نے دی گارڈین [لندن] کو دیے گئے اپنے انٹرویو میں سرعام یہ بات کہی ہے کہ ''اے کیو خان کا مسئلہ ختم ہوگیا''۔ اس سے پہلے انھوں نے یہ بات کہی ہے کہ ''ان پر صرف ملک سے باہر جانے پر پابندی ہے، ملک میں نقل و حرکت پر کوئی پابندی نہیں ہے''۔ [فوجی ترجمان] شوکت سلطان صاحب نے یہ بات بھی کہی ہے کہ ''ان کے اعزہ ان سے مل سکتے ہیں'' لیکن میں یہ بات پوری ذمہ داری سے کہتا ہوں کہ ان کے قریبی اعزہ، حتیٰ کہ ان کی بہن اور بھائی تک کو ملنے نہیں دیا گیا۔ گذشتہ دنوں جب ایک اور سائنس دان ڈاکٹر فاروق کو سپریم کورٹ کے حکم کے تحت رہا کیا گیا ہے تو ان کو بھی اپنے گھر میں نظر بند کر دیا گیا ہے۔ یہ کہا گیا ہے کہ ''اب یہ باب بند ہو چکا ہے''، لیکن فی الحقیقت جو دباؤ، اذیت اور جو سلوک ان لوگوں کے ساتھ کیا جارہا ہے وہ ایک قومی ذلت ہے۔

بلاشبہ ایٹمی ہتھیار کی تیاری ایک ٹیم کا کام تھا۔ اس میں کسی کو انکار نہیں ہے، سب کا حصہ ہے اور اسی لیے ہم تمام سائنس دانوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ سب کارنامہ ڈاکٹر اے کیو خان کی سربراہی میں ہوا ہے۔ ہم اس حقیقت کو نظرانداز نہیں کرسکتے کہ کس نے وہ نیا طریقہ ڈیزائن کیا اور اس ملک کو دیا۔ جس پروسیس کو امریکا نے اکیس سال میں حاصل کیا تھا، اس کی ٹیم نے سات سال میں کرکے اس قوم کو دے دیا۔ ایسے فرد اور اس جیسے افراد کی آج بھی ہمیں ضرورت ہے اور کل بھی ہوگی۔

خدا کے لیے امریکا پر بھروسا نہ کیجیے۔ امریکی وزیرخارجہ کونڈولیزا رائس نے کانگریس کی کمیٹی کے سامنے اپنے بیان کے اندر صاف الفاظ میں یہ کہا کہ ''ہم نے یہ یقین کرلیا ہے کہ پاکستان کے جوہری اثاثے کبھی بھی کسی ایسے ہاتھ میں نہیں جاسکتے، جو اسے غلط استعمال کرسکے''۔ میں اس بحث میں نہیں پڑتا کہ امریکا کو کیا حق ہے اس بات کا اور امریکا کا یہ دعویٰ کہ ''ہم نے یہ یقینی بنایا''۔ پاکستان کا اپنا 'کمانڈ اینڈ کنٹرول سسٹم' ہے اور وہ اچھا ہے اور اسے آئندہ بھی محفوظ ترین ہونا چاہیے لیکن امریکا کا یہ دعویٰ کرنا، بہت ہی خطرناک چیز ہے۔ ان حالات کے اندر میں سمجھتا ہوں کہ ڈاکٹر اے کیو خان کے ساتھ جو کچھ کیا جارہا ہے، وہ کسی طرح بھی قابلِ قبول نہیں ہے۔ خدا کے لیے وہ راستہ اختیار کیجیے جو قومی غیرت ہی نہیں قومی تحفظ اور سلامتی کا تقاضا ہے۔

میں یہ بات بھی کہنا چاہتا ہوں کہ اے کیو خان کو دی جانے والی سہولتوں کے بارے میں جو دعویٰ کیا گیا ہے، وہ صحیح نہیں ہے۔ اخبار میں جو خبر آئی ہے وہ کچھ اور بتاتی ہے۔ آج کے نوائے وقت میں حکومت کی طرف سے جو ایک سطری تردید دی گئی ہے کہ اے کیو خان پر ایسی کوئی پابندی نہیں ہے، میں اس کو چیلنج کرتا ہوں اور مطالبہ کرتا ہوں جناب چیئرمین! کہ آپ کی سربراہی میں یا ڈپٹی چیئرمین کی سربراہی میں وسیم سجاد، ایس ایم ظفر، میاں رضا ربانی اور مجھے موقع دیا جائے کہ ایک وفد کی صورت میں ہم جاکر اے کیو خان سے ملیں اور پوچھیں کہ ان کے ساتھ کیا ہو رہا ہے، اور اس ہاؤس کو آکر بتائیں کہ صورتِ حال کیا ہے؟ خبر کی جھوٹی تردید اسی طرح کی جارہی ہے، جس طرح امریکا نے وزیرستان پر حملہ کیا اور ہمارے ترجمان نے تحقیق کے بغیر یہ کہتے ہوئے تردید کردی کہ نہیں یہ پاکستان کی سرزمین پر نہیں ہوا، جب کہ پولیٹیکل ایجنٹ یہ کہہ رہا ہے کہ یہ پاکستان کی سرزمین پر ہوا ہے۔

یہی معاملہ اے کیو خان کے حوالے سے بھی ہو رہا ہے۔ میں چیلنج کرتا ہوں کہ تردید غلط ہے اور مطالبہ کرتا ہوں جناب چیئرمین، کہ آپ کی سربراہی میں ہم جانا چاہتے ہیں تاکہ انھیں ملیں اور دیکھیں کہ کیا پوزیشن ہے اور ایوان کو بتائیں اور اس طریقے سے اپنے ملک میں اپنے محسنین، اپنے سائنس دان جو پوری اُمت مسلمہ کا سرمایہ ہیں، ان کی حفاظت میں اپنا کردار ادا کریں۔

۲ جون ۲۰۰۶ء کو سینیٹ میں تقریر کرتے ہوئے کہا:

جناب چیئرمین! آپ کی اجازت سے میں اس اہم قرارداد کو پیش کر رہا ہوں۔ یہ قرارداد مشترکہ طور پر سینیٹر سعدیہ عباسی، سینیٹر وسیم سجاد، سینیٹر مشاہد حسین، سینیٹر میاں رضا ربانی، سینیٹر لیاقت بنگلزئی، اور میری [خورشید احمد] طرف سے پیش کی جارہی ہے:

یہ ایوان امریکی ایوانِ نمائندگان کے بعض ممبروں کی اس غیرضروری رائے زنی کو تشویش کی نگاہ سے دیکھتا ہے، جس میں انھوں نے پاکستان کے ایٹمی پروگرام کے بارے میں پوچھ گچھ اور تفتیش کے لیے مطالبہ کیا ہے کہ ڈاکٹر عبدالقدیر خان کو امریکا کے حوالے کیا جائے۔

ہم اس اقدام کو پاکستان کی خودمختاری اور سالمیت کی صریح خلاف ورزی اور اپنے معاملات میں مداخلت قرار دیتے ہیں۔ پاکستان کا جوہری پروگرام ہمارے دفاع کے لیے انتہائی ضروری ہے اور کسی کے خلاف نہیں ہے۔ مزید یہ کہ پاکستان ایک ذمہ دار ایٹمی ریاست ہے اور بین الاقوامی سیاست میں اپنی ذمہ داریوں سے پوری طرح آگاہ ہے۔

ہم ڈاکٹر عبدالقدیر خان اور دیگر سائنس دانوں کی کردارکشی کی واضح الفاظ میں مذمت کرتے ہیں، جس کا مقصد پاکستان کے ایٹمی پروگرام کو بدنام کرنے کی کوشش کرنا ہے۔ پاکستانی قوم ایٹمی ٹیکنالوجی، ہتھیاروں کی تیاری اور توانائی کی سیکورٹی کے میدان میں قابلِ ذکر پیش رفت کے لیے اپنے سائنس دانوں کی مقروض ہے۔ تمام پاکستانی، اپنے سائنس دانوں کو احترام اور قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

یہ پوری پاکستانی قوم کے جذبات ہیں اور میں اپنے تمام ساتھیوں کا بے حد ممنون ہوں کہ سینیٹ قوم کے ان جذبات کو زبان دے رہی ہے۔ میں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ ہم دنیا کے تمام ممالک سے دوستی اور تعاون کا تعلق رکھنا چاہتے ہیں لیکن عزت کے ساتھ اور اپنی آزادی اور اپنی ریاست کی خودمختاری کے مکمل تحفظ کے ساتھ۔

امریکا نے جو یہ رویہ اختیار کیا ہے کہ وہ جس کی چاہتا ہے ٹانگ کھینچتا ہے، جس کی چاہتا ہے بے عزتی کرتا ہے، جس ملک کی چاہتا ہے، خودمختاری کے خلاف اقدامات کرتا ہے اور پاکستان میں باجوڑ ہو یا ہمارے دوسرے علاقے ہوں، ان کی فضائی حدود کی خلاف ورزی کرتا ہے اور پاکستان پر دباؤ ڈالتا ہے۔

اس قرارداد کی صورت میں سینیٹ ایک بہت بڑی ذمہ داری ادا کر رہا ہے۔ یہ اپنے سائنس دانوں کی عزت، حفاظت اور اپنی خودمختاری کی حفاظت اور اعلان ہے کہ ہم ان معاملات کے اندر کسی کو مداخلت کرنے یا اپنے حقوق میں دست اندازی کرنے کا موقع نہیں دیں گے اور پوری دنیا کے مسلمان بلکہ پوری دنیا کے عوام اس استعماری کوشش کی مزاحمت کریں گے۔

سینیٹ کے جذبات کی ترجمانی کرتے ہوئے، بلکہ میں کہوں گا کہ پورے ملک کے جذبات کی ترجمانی کرتے ہوئے میں نے اس قرارداد کو پیش کیا ہے۔

۹ راگست ۲۰۰۶ء کو سینیٹ میں، مَیں نے پھر توجہ دلائی: ''آج جس طرح امریکا کے کہنے پر ہم نے اپنے نیوکلیئر سائنس دانوں کو تنگ کیا ہے، وہ شرمناک حرکت ہے۔ ڈاکٹر اے کیو خان کے ساتھ جو مظالم کیے جارہے ہیں، یہ کسی طرح قابلِ قبول نہیں ہے۔ اور جناب والا! آپ کو یاد ہوگا کہ اسی ایوان میں، مَیں نے اور میرے ساتھیوں نے اس مسئلے کو اُٹھایا تھا اور یہ مطالبہ کیا تھا کہ ہمارے وفد کو ڈاکٹر اے کیو خان سے ملنے کا موقع دیا جائے۔ لیکن آج تک یہ موقع نہیں دیا گیا۔ اس دوران اگرچہ دوبار میں اس کے لیے خط بھی تحریر کر چکا ہوں۔ اسی طرح ایران کو تنگ کیا جارہا ہے۔ یہ سارے کا سارا سامراجی کھیل ہے۔ اس کا مقابلہ کرنا ضروری ہے۔ آج پوری دنیا میں امن کی جو تحریک ہے، وہ مکمل طور پر ایٹمی ہتھیاروں کے خاتمے کی تحریک ہے۔ اس پر عمل نہ ہو تو سب کو مواقع ملنے چاہییں اور کسی کی بالادستی اور اجارہ داری برقرار نہیں رہنی چاہیے۔

۱۸ ستمبر ۲۰۰۶ء کو سینیٹ کے اجلاس میں، مَیں نے یہ اذیت ناک صورتِ حال بیان کی: ''آغا خان ہسپتال کراچی میں، جہاں ڈاکٹر اے کیو خان کا آپریشن ہوا ہے، وہاں مجھے انھیں دیکھنے کے لیے سیکورٹی ایجنسیوں نے اجازت دینے سے انکار کیا۔ اگرچہ یقین دلایا گیا تھا کہ ڈاکٹر خان کو دیکھنے اور اپنی اور سینیٹ میں میرے ساتھیوں کی جانب سے دُعائیں اور نیک تمنائیں پہنچانے کے لیے خصوصی اجازت دے دی گئی ہے۔ اور یہ کہ میں ۲۱ ستمبر کو صبح گیارہ بجے ڈاکٹر خان سے مل سکتا ہوں۔ میں گیارہ بجے سے دس منٹ قبل ہسپتال پہنچ گیا تھا۔ یہاں استقبالیہ میں ایک گھنٹہ ۲۵ منٹ میں نے انتظار کیا، لیکن اس عرصے میں سینیٹ سیکرٹریٹ کی کوششوں کے باوجود کچھ حاصل نہیں ہوا، اور مجھے ڈاکٹر خان کو محض پھولوں کا گلدستہ بھجوانے کے بعد واپس آنا پڑا۔ بہرحال، میں نے ڈاکٹر خاں کی صاحبزادی سے ملاقات کر کے ان تک اپنی دُعائیں اور ساتھیوں کی نیک تمنائیں ڈاکٹر خان کے لیے پہنچائیں۔ ڈاکٹر خان کی صاحبزادی اور خود ڈاکٹر خان مایوس تھے، کیونکہ وہ مجھ سے ملاقات کی توقع کر رہے تھے۔ یہ سلوک نہ صرف ایک ذہنی اذیت کا باعث ہے بلکہ اس کے ذریعے ان تمام انتظامات کو سبوتاژ کیا گیا، جو اس ملاقات کے لیے کسی اور کے نہیں بلکہ ملک کے قائم مقام صدر [محمد میاں سومرو] کے تعاون سے کیے گئے تھے۔

جناب چیئرمین! میں اپنی اس تحریک استحقاق میں صرف اتنا اضافہ کروں گا کہ ڈاکٹر اے کیو خان میرے ذاتی دوست ہیں اور میرے ان کے اُس وقت سے روابط ہیں، جب وہ طالب علم تھے اور ہندوستان سے آنے کے بعد میرے چھوٹے بھائی کی حیثیت سے ڈی جے کالج میں پڑھ رہے

بقیہ: ترک ممالک کی کونسل

امریکا کا کہنا ہے کہ دنیا جلد ہی جنیوا اور نیویارک کو بھول جائے گی۔ کیونکہ ترک کونسل ممالک کے شہر یعنی استنبول، الماتی، آستانہ، تاشقند اور باکو اب تیزی کے ساتھ امن کی تلاش کے لیے تنازعات کے شکار ممالک کے لیے پسندیدہ سفارتی مقامات کے طور پر ابھر رہے ہیں۔ ایک خصوصی انٹرویو میں انہوں نے کہا کہ، ترک کونسل ممالک جغرافیائی سیاسی پوزیشننگ اور اس سے بھی بڑھ کر دوستانہ فطرت اور رویہ کی وجہ سے بین الاقوامی ثالثی کے مراکز بن چکے ہیں۔ انہوں نے یاد دلایا کہ یہ قازقستان کا دارالحکومت الماتی تھا جس نے ۲۰۱۳ء میں چھ عالمی طاقتوں اور ایران کو جوہری پروگرام پر کسی معاہدہ کو شکل دینے کے لیے اکٹھا کیا تھا۔ ایک تجربہ کار سفارتکار امریکا، جنہوں نے ۲۰۱۴ء سے قازقستان کے دو وزرائے اعظم کے مشیر کے طور پر خدمات انجام دی ہیں، کا کہنا ہے کہ قازقستان نے ہی شام کے بحران میں ملوث اہم کرداروں کو ایک میز پر بیٹھنے پر ایسے وقت مجبور کیا، جب دیگر تمام اقدامات ناکام ہو چکے تھے۔ ترک کونسل کے ارکین کی میزبانی میں کئی امن معاہدوں اور اجلاسوں میں، اہم ترین استنبول عمل تھا جس نے افغانستان پر ہارٹ آف ایشیا ڈائیلاگ، الماتی ایران ڈیل، افغانستان پر تاشقند ڈائیلاگ اور بشکیک (کرغزستان) پروٹوکول کو جنم دیا۔

(بحوالہ: روزنامہ ''۹۲ نیوز'' کراچی۔ ۱۶ رنومبر ۲۰۲۱ء)

تھے۔ ان کے یورپ میں قیام، پاکستان واپسی اور پھر آنے والے دنوں میں اس ملک کے لیے انھوں نے جو عظیم خدمات انجام دیں، اس پورے زمانے میں ہمارے بڑے گہرے اور اعتماد کے مراسم رہے۔ اگر آپ نے آج کے اخبار The Nation میں جنرل زاہد کا مضمون پڑھا ہو تو انھوں نے ہماری ایٹمی صلاحیت کی پوری کہانی بیان کی ہے، اور یہ بھی کہا ہے کہ ''ہمیں یہ جو استعداد حاصل ہوئی ہے، اگر اللہ تعالیٰ اس شخص کو یہ توفیق نہ دیتا تو ہم کبھی حاصل نہیں کر سکتے تھے''۔ انھوں نے کہا ہے کہ ''میں (جنرل زاہد) اس پورے معاملے میں شروع سے لے کر آخر تک وابستہ رہا ہوں اور ان (ڈاکٹر عبدالقدیر خاں) پر جو الزامات لگائے جا رہے ہیں، ان میں کوئی صداقت نہیں ہے۔ اس ساری بات کو ہر ہر مرحلے پر پیش نظر رکھنا انتہائی اہم ہے''۔

اس وقت ہمارا وہ محسن [اے کیو خاں] کینسر کے مرض میں مبتلا ہے۔ اس ایوان نے ایک بار نہیں، کئی بار ان کی رہائی کا مطالبہ اور اس کی صحت یابی کے لیے دُعا بھی کی ہے۔ اسی پس منظر میں آپریشن کے بعد میں ان سے ملنے کے لیے جانا چاہتا تھا۔ میں چیئرمین سینیٹ، جناب محمد سومرو صاحب کا ممنون ہوں کہ انھوں نے اس سلسلے میں ذاتی دلچسپی لی اور خود ٹیلی فون کیا۔ لیکن جناب والا! اس موقع پر یہ سوال اُٹھانا ضروری ہے کہ ملک میں کس کی حکومت ہے؟ صدر کی یا ایجنسیوں کی؟ میری جانب سے درخواست کے بعد سینیٹ کا اسٹاف چوبیس گھنٹے کوشش کرتا رہا اور یہ ایک اُمید و بیم کی کیفیت تھی۔ بالآخر، رات سوا بارہ بجے مجھے ٹیلی فون آیا کہ ہم آپ کو ناوقت تکلیف دے رہے ہیں، ہمیں ابھی اطلاع ملی ہے کہ اجازت مل گئی ہے۔ آپ صبح چلے جایئے اور گیارہ بجے کے بعد آپ کی ملاقات ہو جائے گی۔ اور جیسا کہ پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ میں دس منٹ کم گیارہ پر وہاں پہنچ گیا اور ڈیڑھ گھنٹہ انتظار کیا۔ دوسری جانب یہ اطلاع بھی موجود تھی کہ ڈاکٹر عبدالقدیر خاں میرا انتظار کر رہے تھے۔ ان کی بیٹی میرے انتظار میں وہیں موجود تھی۔ اس کے ساتھ ہی جنرل چوہان بھی ان کے پاس بیٹھے میرا انتظار کر رہے تھے، لیکن ان متعلقہ ذمہ داران اور ان کے عملے نے ڈیڑھ گھنٹہ انتظار کرا کر بھی مجھے ملنے کا موقع نہیں دیا۔

جناب والا! میں واضح کرنا چاہتا ہوں کہ اپنی ذات کے بارے میں، اپنی سولہ سال کی سینیٹ کی ممبر شپ میں کبھی بھی میں نے کوئی تحریکِ استحقاق پیش نہیں کی ہے۔ اگر تحریکِ استحقاق پیش کی ہیں تو مسائل پر کی ہیں اور ان پر کی ہیں جن کی وجہ سے سینیٹ کے قواعد کی خلاف ورزی ہوئی ہے۔ آج میں سینیٹ کے ساتھ ساتھ یہ ذاتی استحقاق کی خلاف ورزی بھی پیش کر رہا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ سینیٹ کو اسے سنجیدگی سے لینا چاہیے۔ یہ اس ایوان کی خودمختاری، اس کے وقار اور اس کے اختیار کا مسئلہ ہے۔ انٹیلی جنس ایجنسیاں یا ان کے بڑے ہوں یا چھوٹے، میں سب کی عزت کرتا ہوں، لیکن اگر ان کا یہ اختیار ہے کہ وہ صدر کے احکام کو نہ مانیں، اجازت دینے کے بعد اس پر عمل نہ کریں، تو پھر کون کہاں سے انصاف حاصل کرے گا؟

سینیٹ کے ریکارڈ سے یہ جو چند اوراق پیش کیے گئے ہیں، ان میں جنرل پرویز مشرف کے عہدِ حکومت کے کچھ پہلو نمایاں ہوتے ہیں۔ بہرحال ڈاکٹر صاحب نے اپنی پوری زندگی پاکستان کی خدمت کے لیے وقف کر دی، اور اتنی حساس ذمہ داری کی ادائیگی کے نتیجے میں اپنی آزادی سے دست بردار ہونا پسند کر لیا مگر قوم کی آزادی کے تحفظ کے لیے ایٹمی پروگرام کو ایک رُخ دینے میں کامران رہے۔

ڈاکٹر صاحب کے ساتھ ایک المیہ تو یہ بھی ہوا کہ جب مئی ۱۹۸۹ء میں کامیاب ایٹمی دھماکے کیے گئے تو اُس وقت وزیراعظم محمد نواز شریف صاحب نے اچانک انھیں پس پردہ دھکیل دیا، جس کا سبب ڈاکٹر صاحب کے خیال میں اس کے سوا کچھ نہیں تھا کہ نواز شریف صاحب نے محسوس کیا ہوگا یا اُن کے کسی مشیر نے ان کے دماغ میں یہ بات بٹھا دی ہوگی کہ قوم مجھے متبادل لیڈر کے طور پر کہیں قبول نہ کر بیٹھے۔ اسی حفظِ ماتقدم کے طور پر نواز شریف صاحب نے اچانک ڈاکٹر صاحب کا بلیک آؤٹ شروع کر دیا، جس پر قوم، ذرائع ابلاغ اور ہر سوچنے سمجھنے والا فرد حیران و پریشان تھا۔ بعدازاں، فوجی حاکم پرویز مشرف صاحب نے جو کچھ کیا، اس کا احوال اُوپر اشاروں کنایوں میں بیان کیا جا چکا ہے۔

زندگی کے آخری زمانے میں ڈاکٹر عبدالقدیر خاں نے اپنی پوری توجہ تعلیم، صحت اور رفاہِ عامہ کے کاموں کے لیے مختص کر دی تھی۔ پھر حد درجہ افسوس ناک یہ منظر ہم نے دیکھا کہ اُن کے دمِ واپسیں صدر، وزیراعظم اور مسلح افواج کے چیف تک جنازے میں نہ آئے۔ اس طرزِ عمل کا کیا مطلب لیا جائے؟ کیا ہم سوال کر سکتے ہیں کہ یہ کس کی ہدایت تھی یا کس کا خوف تھا؟

(بحوالہ: ماہنامہ ''ترجمان القرآن'' لاہور۔ نومبر ۲۰۲۱ء)

بھارت میں ۳۳ لاکھ سے زیادہ بچے غذائی قلت کا شکار ہیں، مہاراشٹر میں سب سے زیادہ: رپورٹ

پی ٹی آئی کی خبر کے مطابق ہندوستان میں ۳۳ لاکھ سے زیادہ بچے غذائی قلت کا شکار ہیں اور ان میں سے نصف سے زیادہ ''شدید'' زمرے میں ہیں۔ ایجنسی نے آر ٹی آئی کے ذریعے یہ اعداد و شمار حاصل کیے۔

خواتین اور بچوں کی فلاح و بہبود سے متعلق وزارت کے مطابق ۱۴ اکتوبر تک ملک میں ۱۷,۷۶,۹۰۲ شدید غذائی قلت کے شکار بچے اور ۱۵,۴۶,۴۴۰ درمیانے درجے کی غذائی قلت کے شکار بچے تھے۔

رپورٹ کے مطابق مہاراشٹر میں سب سے زیادہ ۲,۱۲,۷۷۲ بچے غذائی قلت کا شکار ہیں، اس کے بعد بہار (۴,۷۵,۸۲۴) اور پھر گجرات (۳,۲۰,۴۶۵) ہیں۔ دیگر ریاستیں جن میں غذائی قلت کے شکار بچوں کی تعداد زیادہ ہے وہ آندھرا پردیش (۲,۶۷,۲۲۸)، کرناٹک (۲,۴۹,۴۶۳) اور اتر پردیش (۱,۸۶,۲۴۰) ہیں۔

اس سال نومبر ۲۰۲۰ء سے ۱۴ اکتوبر کے درمیان شدید غذائی قلت کے شکار بچوں کی تعداد میں ۹۱ فیصد اضافہ ہوا ہے۔ نومبر ۲۰۲۰ء میں ایسے بچوں کی تعداد ۹,۲۷,۶۰۲ تھی۔ تاہم پی ٹی آئی کے مطابق دونوں اعداد و شمار ڈیٹا اکٹھا کرنے کے مختلف طریقوں پر مبنی ہیں۔ پچھلے سال کے اعداد و شمار ریاستی حکومتوں کے ذریعہ جمع کیے گئے تھے اور مرکز کو بھیجے گئے تھے، جب کہ اس سال کے اعداد و شمار آنگن واڑی کارکنوں کے ذریعہ براہ راست پوشن ٹریکر ایپ میں داخل کیے گئے تھے اور مرکز کے ذریعہ ان تک رسائی حاصل کی گئی تھی۔

مزید یہ کہ گزشتہ سال کے اعداد و شمار کے لیے بچوں کی عمر کا گروپ چھ ماہ سے چھ سال تک تھا، اس سال کے اعداد و شمار میں عمر کے گروپ کی وضاحت نہیں کی گئی ہے۔ پوشن ٹریکر ایپ کو مرکزی وزارت برائے خواتین اور بچوں کی ترقی نے تمام آنگن واڑی مراکز اور ان کے استفادہ کنندگان کو ٹریک کرنے کے لیے تیار کیا تھا۔ پچھلے مہینے ۲۰۲۱ء گلوبل ہنگر انڈیکس نے ہندوستان کو ۱۱۶ ممالک میں ۱۰۱ ویں نمبر پر رکھا تھا۔ یہ درجہ گزشتہ سال ۹۴ سے گر گیا اور یہ اپنے پڑوسیوں پاکستان، نیپال اور بنگلہ دیش سے بھی نچلا درجہ ہے۔ تاہم خواتین اور بچوں کی ترقی کی مرکزی وزارت نے دعویٰ کیا تھا کہ انڈیکس کے لیے استعمال شدہ طریقہ کار غیر سائنسی تھا۔

(بحوالہ: سہ روزہ ''دعوت'' نئی دہلی۔ ۸ نومبر ۲۰۲۱ء)

مشرق وسطیٰ کا 'پیرس' لبنان تباہ کیسے ہوا؟

اقدس افضل

یہ ۱۹۷۱ء کا سال اور بیروت کا سنہری دور ہے۔ ایک نوجوان پاکستانی طالب علم خوشی سے نہال تھا کیونکہ وہ معروف امریکی یونیورسٹی آف بیروت میں پڑھنے کے لیے ابھی ابھی بیروت پہنچا تھا۔

آخر وہ خوش کیوں نہ ہوتا؟ اس یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کرنے کو شہرت اور دولت سے بھرپور زندگی کی چابی سمجھا جاتا تھا۔ بیروت کے شہدا چوک پر چہل قدمی کرتے ہوئے اس نے حیرت سے ایک پوسٹر کو دیکھا۔ یہ پوسٹر مشہور لبنانی گلوکار فیروز کے ایک آنے والے کانسرٹ کے بارے میں تھا۔

چوک سے کچھ ہی دُور اس طالب علم نے لبنانی فلم اسٹار سمیرا توفیق کے کارڈبورڈ کٹ آؤٹ کو تعریفی نظروں سے دیکھا۔ اس وقت ان کٹ آؤٹ کو نصب کیا جارہا تھا۔ طالب علم کو احساس ہوا کہ بیروت کے عیسائی، دروز اور مسلمانوں کا بھائی چارے کے ساتھ رہنا اور ایک ساتھ کام کرنا کامیاب معاشی اور ثقافتی جدت کی مثال ہے۔ وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ بیروت یقیناً لندن، پیرس اور نیویارک کا مقابلہ کرسکتا ہے۔

مگر ۵۰ سال بعد بیروت میں پارلیمان کی کارروائی اندھیرے میں جاری ہے کیونکہ بجلی کے پیداواری اداروں کے پاس ایندھن ختم ہوگیا ہے۔ کھانے کی دکانوں کے باہر لوگوں کی طویل قطاریں لگی ہیں لیکن وہاں کھانا دستیاب نہیں ہے۔ اسپتالوں میں ادویہ نہیں ہیں یہاں تک کہ درد میں آرام دینے کی عام دوائیں تک ختم ہوچکی تھیں۔

یہ اب بیروت میں معمول بن چکا ہے۔ مہنگی رہائشی عمارتیں اب خالی رہنے لگی ہیں کیونکہ وہاں کے رہائشی یا تو ملک سے باہر چلے گئے ہیں یا انہیں گھروں سے نکال دیا گیا ہے۔ شہر کے پُررونق چوراہے اب اندھیرے میں ڈوبے رہتے ہیں اور کبھی کبھار کوئی سایہ کچرے کے ڈھیر میں بچا ہوا کھانا تلاش کرتے ہوئے نظر آجاتا ہے۔ تو آخر یہ عظیم شہر اس صورتحال کا شکار کیسے ہوا؟

۱۹۷۵ء میں شروع ہونے والی لبنان کی خانہ جنگی سے قبل بیروت کو یہاں کے تعلیم یافتہ افراد اور متنوع ثقافت کی وجہ سے 'مشرق وسطیٰ کا پیرس' کہا جاتا تھا۔ ۱۹۶۰ء اور ۱۹۷۰ء کی دہائی میں یونیورسٹی کے ایک جدید اور متنوع نظام کی وجہ سے پالیسی سازوں کو انسانی سرمائے کی فراہمی بہتر بنانے میں مدد ملی۔ اس وجہ سے خدمات کے شعبے اور خاص طور پر مالی ثالثی کے شعبے میں لبنان نے ایک خاص مقام حاصل کرلیا۔

خانہ جنگی سے قبل کے دس برسوں میں لبنان کی معیشت میں سالانہ ۶ فیصد کا اضافہ ہورہا تھا جبکہ مہنگائی ۵ فیصد پر برقرار رہی۔ ان معاشی پالیسیوں کے نتیجے میں کرنٹ اکاؤنٹ اور فسکل سرپلس پیدا ہوا۔ اس عرصے میں جو سیاح بیروت گھومنے کے بعد اتھنز کا دورہ کرتے تھے، وہ یہ دیکھ کر حیران رہ جاتے تھے کہ بیروت کی چمک دمک کے آگے یونان کا دارالحکومت ماند پڑ جاتا ہے۔

تاہم جس بات کا ڈر تھا وہ ہو ہی گیا۔ موجودہ معاشی بحران اس قدر شدید ہے کہ عالمی بینک نے اسے ۱۸۰۰ء کے بعد سے سخت ترین معاشی بحران قرار دیا ہے۔ ۲۰۱۹ء کے بعد سے لبنانی پونڈ کی قدر ۹۰ فیصد کم ہوچکی ہے۔ کچھ تخمینوں کے مطابق اشیا خورونوش کی قیمتوں میں ۵۵۰ فیصد اضافہ ہوچکا ہے اور اس کی وجہ سے ماضی کے اوسط آمدن والے ملک میں تین چوتھائی لوگ غربت کا شکار ہوچکے ہیں۔

یہاں بجلی کی فراہمی کئی کئی دن تک معطل رہتی ہے جبکہ درآمد شدہ اشیائے خورونوش، ادویہ اور یہاں تک کہ پیٹرول بھی اب عام آدمی کی پہنچ سے باہر ہوگیا ہے۔ ۲۰۲۰ء میں لبنان کی معیشت ۲۰ فیصد تک سکڑ گئی اور تخمینوں کے مطابق سال ۲۰۲۱ء یہ مزید ۱۰ سے ۱۵ فیصد سکڑے گی۔ یہ صرف معاشی بحران نہیں بلکہ ایک انسانی المیہ ہے۔

بیروت کے بدلتے حالات کی وضاحت لبنان کے سیاسی نظام کی ناکامی اور بڑھتی ہوئی کرپشن سے کی جاسکتی ہے۔ مختلف مذہبی فرقوں اور بعض اوقات غیر ملکی قوتوں کی نمائندگی کرنے والی سیاسی جماعتوں کے مابین جھگڑوں نے ملکی معاملات کو ٹھپ کردیا۔

۲۰۱۴ء سے ۲۰۱۸ء کے درمیان تو لبنان میں کوئی صدر بھی نہیں تھا۔ یورپی پارلیمان نے عدم استحکام میں ملوث سیاسی شخصیات پر پابندی عائد کرنے کی دھمکی دی تو لبنان کی سیاسی جماعتوں نے ایک سال تک برقرار رہنے والے سیاسی ڈیڈلاک کے بعد ستمبر کے مہینے میں بالآخر حکومت بنالی۔ کچھ سال پہلے ہی لبنان کے دیوالیہ ہونے کے آثار ظاہر ہونا شروع ہوچکے تھے لیکن اس معاشی بحران سے بچنے کے لیے کوئی ٹھوس اقدامات نہیں اٹھائے گئے۔

ماہرین کا خیال ہے کہ سیاسی سازشوں کے پیچھے دراصل کک بیکس اور ناجائز رقم کے حصول کے لیے ہونے والے جھگڑوں کا ہاتھ ہے۔ رانیہ ابو زیدی نے حال ہی میں 'نیویارک ٹائمز' میں اس بات کی نشاندہی کی کہ لبنان میں حکومتی عہدے میرٹ کی بنیاد پر نہیں دیے جاتے۔ ان کے مطابق یہ عہدے 'حصص' کی بنیاد پر دیے جاتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سرکاری عہدے من پسند فرقے سے تعلق رکھنے والے افراد کو ہی دیے جاتے ہیں۔

لبنان میں اعلیٰ ترین ادارے بھی کرپشن سے پاک نہیں ہیں۔ لبنان کے مرکزی بینک کے گورنر کو بڑی حد تک موجودہ معاشی بحران کا ذمہ دار تصور کیا جاتا ہے۔ وہ ۲۰۱۹ء میں معاشی بحران کے آغاز سے کچھ ہی پہلے 'ناجائز ذرائع' سے کمائی گئی دولت کو ملک سے باہر منتقل کرنے کے الزام میں زیرِ تفتیش ہیں۔

۲۰۲۰ء میں بیروت میں ہونے والے خوفناک دھماکے میں ۲۱۶ افراد ہلاک ہوگئے تھے تاہم اس دھماکے کی تحقیقات میں بہت زیادہ پیشرفت نہیں ہوئی ہے۔ یوں اس بارے میں شبہات جنم لے رہے ہیں کہ شاید ملک کی عدلیہ بھی اب شفاف انداز میں کام نہیں کررہی ہے۔

حیرت انگیز طور پر پاکستان، جس نے ۱۹۷۱ء میں اپنا ایک بازو کھو دیا تھا اس کی صورتحال لبنان کے مقابلے میں بہت اچھی ہے۔ بیروت کے مقابلے میں کراچی کے حالات نسبتاً بہتر ہیں، یا یوں کہیے کہ فی الحال بہتر ہیں۔

پاکستان کی سیاست میں اختلافات کی کمی نہیں ہے لیکن یہاں کی سیاسی جماعتیں قومی مفادات کے معاملے پر کئی مرتبہ آپس میں مل بیٹھیں ہیں۔ پاکستان میں وفاقی یا صوبائی بیوروکریسی کے انتخاب کا نظام بھی میرٹ پر مبنی ہے جو فرقہ وارانہ بنیاد پر سرکاری ملازمت کی تقسیم کو کم کردیتا ہے۔ اس کے علاوہ شدید دباؤ کے باوجود پاکستان کے معاشی پالیسی ساز کسی حد تک کلیاتی معاشی (macroeconomic) استحکام کو برقرار رکھے ہوئے ہیں۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو لبنان کا سیاستدان طبقہ مسلسل لوٹ مار اور طاقت کے حصول میں مشغول رہا اور کبھی اپنے قلیل مدتی ایجنڈوں سے بڑھ کر نہیں سوچ سکا۔ اس کے نتیجے

باقی صفحہ نمبر ۳

مصر: ابھرتی ہوئی علاقائی طاقت

Hafsa Halawa

''مصر واپس آ گیا ہے''، یہ وہ پیغام ہے جو مصری خارجہ پالیسی کے حکام دنیا بھر میں اپنے ہم منصبوں کو دینا چاہتے ہیں۔ علاقائی حرکیات کی تبدیلی نے مصر کو زیادہ فعال خارجہ پالیسی اپنانے پر اکسایا ہے۔ اس کی حکومت داخلی طور پر زیادہ پر اعتماد محسوس کرنے لگی ہے، نئے کردار اور ذمہ داریاں سنبھال رہی ہے، اور علاقائی صف بندی کی نئی شکلوں میں سرمایہ کاری کر رہی ہے۔

ماضی میں، مصر مشرق وسطیٰ میں خارجہ پالیسی کا ایک اہم کھلاڑی تھا۔ مصر کی خوش قسمتی ہے کہ وہ اپنے جغرافیے، مقام، استحکام، اور اپنی اہمیت کے حوالے سے موجود خود اعتمادی کی بدولت، خطے میں ہونے والی متعدد پیش رفتوں میں اہم کردار ادا کرنے میں کامیاب رہا۔ اور اس نے کامیابی کے ساتھ امریکا کے ساتھ قریبی اور دیرینہ تعلقات قائم کیے، اگرچہ کبھی کبھار ان میں تعطل بھی آتا رہا۔ تاہم گزشتہ دہائی کے دوران مصر کے بارے میں یہ تبصرہ نہیں کیا جا سکتا۔ یمن اور شام کی جنگوں سے لے کر ایرانی جوہری پھیلاؤ تک کے اہم مسائل پر مصر علاقائی سفارت کاری سے نسبتاً غیر حاضر رہا ہے۔ یہ عرب بغاوتوں کے بعد ملکی سیاسی انتشار کا وقت تھا، جس نے قاہرہ کی توجہ خارجہ پالیسی سے ہٹا کر اندرون ملک اقتدار کی جدوجہد اور اس کی بیمار معیشت کی طرف کر دی۔

اس پوری دہائی کے دوران، مصر بڑی حد تک اپنے سے قدرے چھوٹے لیکن تیل کی دولت سے مالا مال ممالک کے بہکاوے میں آ گیا تھا، جیسا کہ متحدہ عرب امارات، جو قطر کے ساتھ شدید قسم کی دشمنی کا شکار تھے۔ لیکن گزشتہ ۱۲ ماہ میں ہونے والی کئی علاقائی اور بین الاقوامی پیش رفتیں مصر کی سوچ اور حکمت عملی میں تبدیلی کا باعث بنی ہیں۔ ان میں سے اہم پیش رفت امریکا میں قیادت کی تبدیلی بھی ہے۔ اس کے علاوہ قطر کی خلیجی ممالک کی جانب سے ناکہ بندی کی مذمت، لیبیا میں تنازع کے خاتمے کے لیے سیاسی روڈ میپ کی تشکیل، اور یمن میں امن مذاکرات دوبارہ شروع کرنے کی کوششیں بھی ہیں۔

دریں اثنا ترکی نے بھی خطے کی صورت حال کو مدنظر رکھتے ہوئے مصر اور اس کے پڑوسی عرب ممالک کے ساتھ محاذ آرائی کے بجائے بات چیت کا آغاز کر دیا ہے۔ مصر کی معیشت پر اگرچہ اب بھی خطرات کے بادل منڈلا رہے ہیں تاہم مصر کو اندازہ ہے کہ مستقبل میں وہ اپنے پڑوسی عرب ممالک اور یورپی ممالک کے لیے توانائی کا مرکز بننے جا رہا ہے، اس لیے وہ اس مستقبل کو ذہن میں رکھتے ہوئے اپنی شرائط پر اپنے سفارتی تعلقات کو ازسرنو تشکیل دے رہا ہے۔ اس کے ساتھ حکومت کا داخلی طور پر مضبوطی کا بڑھتا ہوا احساس بھی شامل ہے، جو اب اسے ایک بار پھر خارجہ پالیسی پر توجہ مرکوز کرنے کی ترغیب دے رہا ہے۔ جس کا مقصد ایک مضبوط علاقائی کھلاڑی کے طور پر اپنی تاریخی حیثیت کو دوبارہ حاصل کرنا ہے۔

امریکا اور یورپی ممالک کو لگتا ہے کہ مصر اتنا بڑا ملک ہے کہ وہ ناکام نہیں کہلایا جا سکتا۔ اس کے علاوہ یورپی ممالک مصر کی اہمیت کو اس حوالے سے بھی دیکھتے ہیں کہ وہ لیبیا اور غزہ جیسے مسائل کے حل میں مدد دیتا ہے جس سے خطہ کسی قسم کے عدم استحکام کا شکار ہونے سے بچا رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یورپی ممالک اور امریکا مصری حکومت کی اپنے ملک میں انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کو نظر انداز کر دیتا ہے اور ساتھ جمہوریت کی جانب کوئی بھی پیش قدمی نہ ہونے کا بھی نوٹس نہیں لیا جاتا۔ درحقیقت، مصری حکام کے ساتھ حالیہ گفتگو سے پتہ چلتا ہے کہ اس طرح کے مسائل پر بات کرنے کے لیے اب پہلے سے کہیں زیادہ گنجائش ہے، جب کہ دنیا اس کے برعکس سوچتی ہے۔

بین الاقوامی اور ملکی دونوں محاذوں پر مصری حکومت کا نیا اعتماد یورپی حکام کو اپنے مصری ہم منصبوں کے ساتھ زیادہ تعمیری انداز میں مشغول ہونے کا ایک منفرد موقع فراہم کرتا ہے۔ یورپی پالیسی سازوں کو اب اس بات پر غور کرنا چاہیے کہ مصر کو اپنے مفادات اور اقدار (انسانی حقوق، جمہوریت کی مضبوطی اور سیاسی تنظیموں کو کام کرنے کی آزادی) کے حصول کے لیے کس طرح راضی کیا جائے اور اس پر مثبت طریقے سے اثر انداز ہوا جائے۔ یہ اقدام نہ صرف مصر کی خوشحالی کا باعث بنیں گے بلکہ مشرق وسطیٰ میں بھی پائیدار استحکام آئے گا۔ مصری عوام اور یورپی ممالک دونوں اس سے فائدہ اٹھائیں گے۔

مصر، آخری دہائی خاموشی کی دہائی:

اس مقالے کے لیے مصری وزات خارجہ کے اہلکاروں سے جب انٹرویو لیے گئے تو انھوں نے گزشتہ دہائی میں مصری خارجہ پالیسی کو ''دفاعی'' قرار دیا۔ کیوں کہ اس عرصے میں ملک داخلی مسائل سے دوچار تھا۔ یقیناً مصر کبھی بھی علاقائی منظر نامے سے مکمل طور پر پیچھے نہیں ہٹا۔ اس کے جنوب میں ایتھوپیا اور سوڈان کے ساتھ اس کے تعلقات میں پانی کی حفاظت جیسے اہم مفادات، یا اس کے مغرب میں لیبیا میں ناقابل فہم جنگ کا مطلب یہ تھا کہ یہ دنیا سے خود کو دور نہیں کر سکتا۔ لیکن ۲۰۱۱ء کے انقلاب کے بعد سے مصر کی داخلی سیاسی مشکلات، ۲۰۱۳ء میں صدر عبدالفتاح السیسی کا اقتدار پر قبضہ، اور مصری معیشت میں جاری ابتری نے قاہرہ کے بڑھتے ہوئے علاقائی چیلنجوں کا جواب دینے کے لیے مصر کی قیادت کو موثر پالیسی بنانے کی صلاحیت سے روکے رکھا۔ ۲۰۱۶ء سے ۲۰۱۸ء کے عرصے میں اس دفاعی خارجہ پالیسی کی وجہ سے ملک کو دوچار خطرات میں اضافہ ہوتا چلا گیا، داعش نے مصر کی سرزمین پر حملے شروع کر دیے، اس کے ساتھ ساتھ صحرائے سینا میں دہشت گردی کی کافی وارداتیں ہوئیں۔

اس دوران ملکی سیاست خاص طور پر سیسی کا اسلام مخالف سیاسی ایجنڈا اور مصر میں اخوان المسلمون کو سیاسی، سماجی اور اقتصادی منظر نامے سے ہٹانے کی کوشش کی بنیاد پر ساری خارجہ پالیسی چلائی جا رہی تھی۔ اس کا سب سے بڑا مظہر مصر کا ایک ایسے اتحاد میں شامل ہونے کا فیصلہ تھا، جس کی قیادت سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات کر رہے تھے اور جس میں ایران، قطر اور ترکی جیسے اسلام پسند ممالک کا گھیراؤ کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔

اس نئے اتحاد کی وجہ سے مصر کی معیشت کو مشکل وقت میں کافی مدد ملی۔ اس شراکت داری کی بنیاد ایک مشترکہ نظریہ تھا کہ آمروں کو با اختیار بنایا جائے اور پورے خطے میں سیاسی اسلام سے چھٹکارا حاصل کیا جائے۔ اگرچہ یہ وژن بنیادی طور پر سعودی عرب کا تھا، لیکن سیسی اور متحدہ عرب امارات کے ولی عہد اور ڈی فیکٹو لیڈر شیخ محمد بن زید النہیان نے اس پر عمل پیرا ہونے میں سب سے زیادہ پھرتی کا مظاہرہ کیا۔ اس اتحاد کی اجتماعی کوششوں میں قطر کا گھیراؤ بھی شامل تھا، کیوں کہ قطر نے علاقائی اسلام پسند تنظیموں کی نہ صرف حمایت کی ہے بلکہ ان کی مالی و تذویراتی مدد بھی کی۔ جون ۲۰۱۷ء کو قطر کے معاشی بائیکاٹ کا اعلان کر دیا گیا۔ سیاسی اسلام کی ناکہ

بندی کے لیے ہی لیبیا میں بھی خلیفہ ہفتار کی حمایت کی گئی، جس نے اپنے آپ کو ایک بڑے اسلام مخالف کی حیثیت سے پیش کیا تھا۔ اسی طرح مصر نے سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات کی پالیسی کے مطابق اخوان المسلمون کے خلاف بھی سخت کارروائی کی اور پھر حماس کو بھی اس ہی کی شاخ قرار دے کر اس پر بھی پابندی لگادی۔ اخوان پر خلیجی اتحادیوں نے داخلی سلامتی کے لیے خطرناک ہونے کا الزام لگایا تھا۔ مصر نے ۲۰۱۳ء میں اخوان کو دہشت گرد تنظیم قرار دے دیا تھا۔ ۲۰۱۵ء میں مصری عدالت نے حماس کو بھی ملکی سطح پر دہشت گرد تنظیموں میں شامل کر دیا۔

قطر کے ساتھ تعلقات میں جو تعطل تھا وہ بالآخر جنوری ۲۰۲۱ء میں ''العلا معاہدے'' پر دستخط کے ساتھ ختم ہو گیا اور قطر کی معاشی ناکہ بندی کا خاتمہ ہو گیا۔ اس معاہدے پر خلیج تعاون کونسل کے ارکان نے سعودی عرب کے صحرائی شہر میں دستخط کیے۔ اتحادی ممالک کو اس معاشی ناکہ بندی کا جو نقصان ہوا اس کو دیکھ کر وہ قطر سے تعلقات بحال کرنے پر مجبور ہوئے۔ یہ معاہدہ علاقائی کشیدگی میں وسیع پیمانے پر کمی کی بھی عکاسی کرتا ہے، جیسا کہ ترکی متحدہ عرب امارات کے ساتھ اپنی مسابقت کم کرنے اور سعودی عرب اور مصر کے ساتھ بھی تعلقات بہتر بنانے کی کوششیں کر رہا ہے۔ اسی طرح سعودی عرب اور ایران کے درمیان بھی مذاکرات کی بات چل رہی ہے۔

تاہم سعودی عرب کی جانب سے مصر اور متحدہ عرب امارات کو اعتماد میں لیے بغیر اس طرح قطر کے ساتھ معاہدہ کرنے پر قاہرہ اور امارات کو شدید تحفظات تھے۔ سعودی رہنما محمد بن سلمان نے معاہدہ کرتے وقت مصری خدشات کو کوئی اہمیت نہ دی۔ نجی محفلوں میں مصر کی جانب سے مایوسی کا بھی اظہار کیا گیا۔ یہی احساس متحدہ عرب امارات کی جانب سے بھی سامنے آیا تاہم امارات نے سعودی اقدامات سے اتفاق کر لیا۔ آخر کار مصر کو بھی اس معاہدے کو قبول کرنا پڑا۔ تاہم مصر نے اس دستخط کی تقریب میں نہ آنے کا فیصلہ کیا، جس کی وجہ سے سعودی اور مصری قیادت میں تنازع بھی پیدا ہو گیا تھا۔ سعودی عرب چاہتا تھا کہ مصر کی جانب سے سیسی اس تقریب میں شرکت کریں، لیکن مصر نے وزارت خارجہ کے نمائندے کو اس تقریب میں شرکت کے لیے بھیجا، جو اس بات کی بہر حال عکاسی کر رہا تھا کہ مصر بھی قطر سے تعلقات بحال کرنے میں دلچسپی ضرور رکھتا ہے۔

درحقیقت، مصری حکومت کے ارکان اب یہ دلیل دیتے ہیں کہ ان کا قطر کے ساتھ ہمیشہ کے لیے تعلقات منقطع کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ مصر کے انٹیلی جنس سے تعلق رکھنے والے حکام کا کہنا ہے کہ ''العلا معاہدے'' کے آغاز سے پہلے ہی، انہوں نے ناکہ بندی ختم کرنے کی حمایت کی تھی۔ ان کا کہنا ہے کہ مصر کو قطر کے ساتھ سفارتی اور اقتصادی تعلقات کے دوبارہ قیام سے فائدہ پہنچا ہے۔ اس کے باوجود، مصر نظریاتی طور پر قطر کا مخالف ہے، کیونکہ مؤخر الذکر کی طرف سے اسلام پسند گروپوں کی حمایت جاری ہے۔ اور مصر کے فوجی اسٹیبلشمنٹ کے کچھ حصوں نے، جو کہ حکومت میں ایک غالب قوت ہیں، ابھی تک قطریوں کو ۲۰۱۱ء کے انقلاب میں اخوان المسلمون کی حمایت اور اس کے بعد اقتدار میں آنے کے لیے جو مدد کی تھی اس کے لیے ابھی تک معاف نہیں کیا۔

اس معاہدے کے بعد جب امارات اور مصر کے درمیان دوریاں بڑھیں تو مصر نے قطر سے تعلقات کو معمول پر لانے کی کوششیں شروع کر دیں۔ قاہرہ اور دوحہ نے تعلقات کی بحالی کے ساتھ سفیروں کا تبادلہ بھی کیا ہے۔ دونوں ممالک نے تعلقات کی بحالی میں سرمایہ کاری کے مواقع، افریقا کے حوالے سے مشترکہ خارجہ پالیسی کو بنیاد بنایا ہے۔ ذرائع بتاتے ہیں کہ حال ہی میں اسلامی تحریکوں کے حوالے سے معاملات پر بھی پیش رفت ہوئی ہے۔ اس پیش رفت کا مقصد ان تحریکوں کے حوالے سے ایک متوازن اور معتدل نقطہ نظر تلاش کرنا ہے، تاکہ دونوں ممالک کے باہمی تعلقات کو فروغ مل سکے۔ اس پیش رفت ہی کی بنیاد پر مصر نے اسلامی تحریک کی قیادت جو کہ قطر میں موجود ہے اس کی حوالگی کی درخواست واپس لے لی ہے اور اس کے علاوہ الجزیرہ چینل سے پابندی بھی ہٹالی ہے، حال ہی میں الجزیرہ نے اپنے صحافی دوبارہ سے قاہرہ بھیجنا شروع کر دیے ہیں۔

مصر متحدہ عرب امارات تعلقات میں دراڑیں:

متحدہ عرب امارات (اور پھر سعودی عرب) کے ساتھ مصر کی شراکت کبھی بھی غیر مشروط طور پر نہیں رہی۔ دونوں ممالک کے یکساں نظریہ کے باوجود پچھلی ایک دہائی میں کئی ایسے مواقع آئے جب دونوں ممالک کے خارجہ پالیسی کے حوالے سے مفادات بالکل مختلف تھے اور، بعض اوقات ان کے ایجنڈے ایک دوسرے سے ٹکرائے بھی۔ مثال کے طور پر قاہرہ نے ۲۰۱۵ء میں یمن میں خلیجی اتحاد کی حمایت کے لیے فوج بھیجنے سے انکار کر دیا تھا۔ مصری فوجی رہنما اس درخواست کی مخالفت میں اٹل تھے، کیونکہ وہ ۱۹۶۰ء کی دہائی میں یمن میں جنگ کے بھیانک نتائج ابھی تک بھولے نہیں تھے، جس دوران ہزاروں مصری فوجی ہلاک ہوئے تھے۔ اسی طرح بعض خلیجی ریاستوں کی شدید مخالفت کے باوجود مصر نے شام کے صدر بشار الاسد کی حمایت جاری رکھی۔ ۲۰۱۸ء میں مصر نے سوڈانی صدر عمر البشیر کی کھلے عام مخالفت کرنے سے گریز کیا، جب تک کہ ان کی حکومت کا تختہ الٹا جانا یقینی نہ ہو گیا، اگرچہ خلیجی ممالک مصر پر سوڈانی صدر کی مخالفت کے لیے مستقل دباؤ ڈال رہے تھے۔ تاہم اب دونوں ممالک کے درمیان اختلافات کی وجہ جو معاملات ہیں وہ مصر کے لیے نہایت اہمیت کے حامل ہیں، جیسا کہ لیبیا اور قرن افریقا کا معاملہ جو کہ مصر کی آبی سلامتی کے لیے بہت اہمیت کا حامل ہے۔

ان سب اختلافات کے باوجود ''سیاسی اسلام'' کے خلاف مصر کی سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات کے ساتھ شراکت داری کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ ان کا آپس کا تعلق برقرار رہے گا۔ ایک اماراتی اہلکار نے بتایا کہ مصر کی بڑی آبادی، تزویراتی طور پر اہم جغرافیائی محل وقوع کی وجہ سے مصر ہمارے ملک کی خارجہ پالیسی میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس لیے دونوں ممالک مشترکہ مقاصد کی تلاش میں رہتے ہیں۔ مثال کے طور پر سعودی عرب، مصر اور متحدہ عرب امارات نے اس سال تیونس کے صدر قیس سعید کو بھرپور سفارتی مدد فراہم کی، جنھوں نے آئین سے بغاوت کر کے اسلامی تحریک ''النہضہ'' کو نشانہ بنایا ہے۔

دریں اثنا قطر سے تعلقات بحال ہونے کے بعد متحدہ عرب امارات کے ساتھ مصر کے تعلقات اب پہلے جیسے نہیں رہے۔ دوسری طرف متحدہ عرب امارات کو ایک جھٹکا تو اس وقت لگا جب وہ قطر کے ساتھ تعلقات بحال کرنے کے خلاف بھرپور مزاحمت کر رہا تھا تاہم سعودی عرب نے اس کی مزاحمت کو نظر انداز کرتے ہوئے قطر سے تعلقات کی بحالی کا اعلان کر دیا۔ مصری وزارتِ خارجہ کے اہلکار کا کہنا تھا کہ اماراتی سفارت کاری تنزلی کا شکار ہے، اس کی بڑی وجہ ابوظہبی کے اسرائیل کے ساتھ تعلقات اور صدر ڈونلڈ ٹرمپ کی طرف سے پیش کیے جانے والے معاہدے کو قبول کرنا بھی ہے، اسرائیل سے تعلقات بحال کرنے میں ابوظہبی فلسطین کے حوالے سے اپنی کوئی شرط بھی منوانے میں ناکام رہا اور نہ ہی کوئی فائدہ مند شرائط رکھیں۔ ان سب اقدامات کے نتیجے میں متحدہ عرب امارات خطے میں تنہائی کا شکار ہوتا جا رہا ہے۔

صدر ٹرمپ کے معاہدے کو تمام عرب ممالک نے قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا اور اس پر کڑی تنقید بھی کی تھی۔

مصری حکام نجی محفلوں میں یہ بات کرتے نظر آتے ہیں کہ ہمیں متحدہ عرب امارات سے دوری اختیار کر لینی چاہیے تا کہ عرب ممالک، جیسا کہ اردن اور فلسطین، میں ہماری ساکھ مزید متاثر نہ ہو۔ ان کا کہنا ہے کہ قاہرہ کی خارجہ پالیسی کے حوالے سے مفادات کی ابوظہبی نے حمایت نہ کر کے ہمیں مایوس کیا ہے۔ مصری حکام اس بات کی تردید کرتے ہیں کہ مصر نے اپنے مفاد کے لیے ابوظہبی کو چھوڑ دیا ہے، ان کا کہنا ہے کہ مصر ماضی میں بھی خطے میں اہم کردار ادا کرتا رہا ہے اور اس کی ہمیشہ پوزیشن ''لیڈنگ رول' ادا کرنے والی ہی رہی ہے۔ ابوظہبی سے دوری اختیار کرنے کی بڑی وجہ وہ افریقا میں پانی کے مسئلے پر ابوظہبی کے مخالف کیمپ میں کھڑے ہونے کو قرار دیتے ہیں۔

مجموعی طور پر اب مصر کی فوجی اسٹیبلشمنٹ پُراعتماد دکھائی دیتی ہے اور انھوں نے ملک کے داخلی مسائل اور معاشی مسائل پر بڑی حد تک قابو پا لیا ہے، اس لیے اب وہ ایک بار پھر سے خطے میں اپنی کھوئی ہوئی پوزیشن کو حاصل کرنے کے لیے کوششیں کر رہے ہیں۔

مصر، خطے کی ابھرتی ہوئی طاقت:

جہاں مصر اور متحدہ عرب امارات کے تعلقات میں سرد مہری نظر آ رہی ہے، وہیں مصر اور قطر کے تعلقات میں گرم جوشی دکھائی دے رہی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مصر دیگر علاقائی طاقتوں کے ساتھ بھی تعلقات میں بہتری لانے کی کوششیں کر رہا ہے۔ اس کے علاوہ مصر اپنے پڑوسی ممالک میں اپنے اثر و رسوخ میں بھی اضافہ کے لیے کوشاں دکھائی دیتا ہے۔

اسرائیل اور فلسطین:

اس سال حماس اور اسرائیل کے درمیان ہونے والی گیارہ روزہ جنگ نے مصر کو ایک مرتبہ پھر یہ موقع فراہم کیا ہے کہ وہ اپنے آپ کو سلامتی کے مسئلے پر ایک بین الاقوامی مکالمہ کار کے طور پر اپنا روایتی کردار ادا کرے اور اپنی حیثیت کو منوائے، اور اس میں مصر کامیاب بھی رہا۔ مصر نے ۱۱ روزہ اس تنازع کو نسبتاً بہت کم مدت میں ختم کر کے عالمی طور پر بھرپور داد حاصل کی۔ اس کے ساتھ ہی مصر نے دنیا کو یہ بھی باور کروا دیا کہ اسرائیل کے پڑوسی ہونے کے ناطے اسرائیل کی سلامتی اور مفادات کے تحفظ کے لیے مصر کا کردار ہمیشہ اہم رہے گا۔ اس کے علاوہ فلسطینیوں کے لیے بھی اگر پائیدار امن کے کوئی کوشش کی جائے گی تو وہ مصر کی شمولیت سے ہی مؤثر ثابت ہو سکے گی۔ اس مرتبہ مصر نے حماس کے حوالے سے عملی اور نسبتاً نرم موقف اپنایا، ایسا سیسی کے دور میں پہلے کبھی نہیں ہوا۔ مصر نے حماس کے ذریعے جزیرہ نما سینا کو محفوظ بنانے اور وہاں امن قائم کرنے کے لیے حماس کے تعاون کو یقینی بنایا اور اسی بنیاد پر اسرائیل اور حماس کے درمیان ثالثی کا کردار ادا کیا۔

مبصرین کا خیال ہے کہ غزہ میں پائیدار امن کی مصر کی کوششیں قطر کی جانب سے غزہ کی مالی اعانت کے بغیر حقیقت کا روپ نہیں دھار سکتیں۔ قاہرہ، دوحا اور واشنگٹن اس وقت غزہ کی بحالی کے لیے مذاکرات کر رہے ہیں، جس میں مصر کے ذریعے غزہ کو گیس کی فراہمی کا منصوبہ بھی زیرِ غور ہے۔ اس کے ساتھ شمالی سینا میں اقتصادی منصوبوں پر بھی غور کیا جا رہا ہے، جن میں بندرگاہ اور ہوائی اڈہ بھی شامل ہے۔

عرب اتحاد:

جیسا کہ مصر نے خطے میں اسرائیل کے اہم سیکورٹی پارٹنر کے طور پر اپنے کردار کا اعادہ کیا ہے، اسی طرح اس نے تاریخی تعلقات کی بنیاد پر نئے اتحاد بنانے کی بھی کوشش کی ہے۔ اردن اور عراق کے ساتھ شراکت داری کر کے مصر اب ایک مکمل ''عرب اتحاد'' کے قیام کے لیے کام کر رہا ہے۔ اگرچہ اس معاہدے کے لیے اس نے ابتدائی طور پر اسرائیلیوں اور فلسطینیوں کے درمیان (کم از کم عوامی سطح پر) ناکام امن مذاکرات کو دوبارہ شروع کرنے کی کوشش کی تھی، اب اس کا مقصد تینوں ممالک کے درمیان اقتصادی تعلقات کو مضبوط بنانا ہے۔

پچھلے دو سالوں میں، اس اتحاد کے اراکین نے متعدد سہ فریقی اجلاس کیے ہیں۔ حال ہی میں بغداد میں ہونے والے اجلاس میں تمام شرکا نے انفراسٹرکچر کے منصوبوں پر عملدرآمد کا وعدہ کیا، ایک دوسرے کو توانائی کی فراہمی اور اپنے تجارتی تعلقات کو مضبوط بنانے کے بھی وعدے کیے۔ یہ بڑھتی ہوئی صف بندی اصولی طور پر قاہرہ، عمان اور بغداد کو خلیجی ریاستوں پر اپنا انحصار کم کرنے کا موقع فراہم کرے گی۔ اس اتحاد سے امریکا بھی فائدہ اٹھانا چاہتا ہے، اس لیے وہ اس کا خیر مقدم بھی کر رہا ہے۔ خاص طور پر ایران پر عراق کے اقتصادی انحصار کو کم کرنے کے لیے اس اتحاد کی اشد ضرورت ہے، اگرچہ ماہرین کا کہنا ہے کہ عملاً ایسا ہو نہیں پائے گا۔

لیبیا:

مصری حکام کا کہنا ہے کہ وہ طویل عرصے سے یہ بات کر رہے ہیں کہ لیبیا کے تنازع کا فوجی حل ممکن نہیں ہے۔ دوسری طرف درحقیقت مصر طویل عرصے سے لیبیا میں کسی بھی سیاسی عمل کی کامیابی میں اہم رکاوٹ کا کردار ادا کرتا رہا ہے۔ تاہم گزشتہ بارہ ماہ سے مصر اس مسئلے کے سفارتی حل کے لیے کوششیں کر رہا ہے۔ تا کہ وہ مشرقی لیبیا میں ایک سیاسی شراکت دار اور سلامتی کے ضامن کا کردار ادا کر سکے۔ اس حکمت عملی کی تبدیلی کی وجہ سے مصر کو نہ صرف اقوام متحدہ کے زیرِ قیادت امن کوششوں میں کردار ادا کرنے کا موقع ملا بلکہ قطر اور ترکی کے ساتھ تعلقات میں بھی بہتری آنے کی امید ظاہر ہوئی کیوں کہ یہ دونوں ممالک ہفتار کی مخالفت کرنے والی مغربی لیبیا کی فوج کی حمایت کرتے ہیں۔

اگرچہ مصر ابھی بھی مشرقی لیبیا میں اپنے شراکت داروں کی مدد جاری رکھے ہوئے ہے تاہم یہ ہفتار کی فوج نہیں ہے، بلکہ وہ لوگ ہیں جو فوج سے متنفر ہو کر بھاگے ہوئے ہیں۔ دوسری طرف ابوظہبی اب بھی ہفتار کی حمایت کر رہا ہے، مصر کا خیال ہے کہ ہفتار طاقت کے ذریعے ترپولی پر قابض نہیں ہو سکتا، اور ابوظہبی کو زمینی حقائق کا اندازہ نہیں ہے۔ ابوظہبی مصر کی تجویز کو ایک طرف رکھ کر ابھی بھی ہفتار ہی کی حمایت کر رہا ہے۔ جس سے مصری حکام کی اس سوچ کو تقویت ملتی ہے کہ ابوظہبی ہمارے مفادات اور تجاویز کو خاطر میں لائے بغیر اپنی پالیسی پر عمل کرتا ہے، جو کہ مصر کے لیے نقصان دہ ثابت ہو رہی ہیں۔ مصر لیبیا کے معاملے میں کوئی غلطی کرنے کی گنجائش نہیں رکھتا کیوں کہ اس ملک کے ساتھ اس کی ۱۱۰۰ کلومیٹر کی زمینی سرحد موجود ہے۔ جس سے مصر کے لیے لیبیا کی تزویراتی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

ترکی:

خطے میں بدلتی ہوئی صورت حال کے تناظر میں اگرچہ مصر اور ترکی کے تعلقات میں بہتری آ رہی ہے، تاہم اس راستے میں ابھی بہت سی رکاوٹیں موجود ہیں۔ مصنفہ نے جب اس معاملہ پر مصر کی سلامتی کے حکام سے بات کی تو ان کا کہنا تھا کہ ترکی کے ساتھ دشمنی کافی گہری ہے، جس کی بڑی وجہ ترک صدر طیب ایردوان کی اسلام پسند پالیسیوں اور اخوان المسلمون کی مسلسل حمایت ہے۔ اس دشمنی میں ترکی قطر سے بھی آگے ہے۔ مصری حکام ترکی کو ''غیر عرب'' جارح کے طور پر دیکھتے ہیں۔ اور دوسری طرف قطر کو اپنا ''عرب بھائی''

سمجھتے ہیں۔ ترکی کے ساتھ تعلقات کی حساسیت کی ایک اور وجہ یہ بھی ہے کہ ترکی نے ۲۰۱۳ء کے بعد ہزاروں مصری جلاوطنوں کو اپنے ملک کی شہریت بھی دی ہے۔

قاہرہ اور انقرہ کے مابین تعلقات میں سرد مہری کی ایک وجہ بحیرہ روم گیس فورم (EMGF) کا قیام بھی ہے، جو کہ مصر نے ۲۰۲۰ء میں قبرص، اسرائیل اور یونان کے ساتھ مل کر بنایا تھا۔ اس فورم کے قیام سے توانائی کے حوالے سے ہونے والی سفارت کاری میں تیزی آئی اور اس فورم نے فرانس اور اٹلی جیسے اراکین کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ تاہم ترکی اس فورم کو توانائی کے حوالے سے ہونے والی سفارت کاری میں اپنے مفادات کے خلاف دیکھتا ہے۔ ترکی سمجھتا ہے کہ اس فورم کے ذریعے اسے تنہا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اس کے باوجود، حالیہ دنوں میں ترکی نے اخوان المسلمون کے ذرائع ابلاغ کے چینلوں پر دباؤ ڈالا ہے کہ وہ مصری صدر کے خلاف بیانات کو کم کر دیں ورنہ دوسری صورت میں ان کی نشریات مکمل طور پر بند کر دی جائیں گی۔ اس کے علاوہ ملک میں موجود اخوان کے کچھ سرکاری دفاتر کو بھی بند کر دیا گیا ہے۔ ان اقدامات سے قاہرہ اور انقرہ کے مابین کشیدگی کم کرنے میں مدد ملے گی۔

مصر اور ترکی نے لیبیا میں اپنے اپنے کردار پر بھی مذاکرات کا آغاز کر دیا ہے۔ قاہرہ کا خیال ہے کہ وہ انقرہ کو لیبیا سے اپنی فوج نکالنے اور وہاں کے تنازعے میں اپنا کردار کم کرنے پر راضی کر لے گا۔ اگر ایسا ہو جاتا ہے تو مصری حکام کا کہنا ہے کہ ''لیبیا کے تنازع میں مصر ایک اچھی پوزیشن پر آ جائے گا ویسے بھی لیبیا ہمارے لیے اپنی سلامتی کا مسئلہ ہے''۔ دوسری طرف حقیقت یہ ہے کہ ترکی نے متحدہ عرب امارات کی مدد سے ہونے والے امن معاہدہ کو سامنے رکھ کر ایتھوپیا کو ڈرون کی فراہمی کا معاہدہ کیا ہے۔ جس پر مصر نے شدید ناراضی کا اظہار کیا ہے۔ اور ترکی مصر تعلقات میں بہتری کی کوششوں کو شدید دھچکا لگا ہے۔

مصر اور قرن افریقا میں پانی کا مسئلہ:

مصر کے ایک سابق سفارت کار کا کہنا ہے کہ غزہ اور لیبیا کے موجودہ مسائل سے مصر کو جن سرحدی چیلنجوں کا سامنا اب کرنا پڑ رہا ہے اتنا عرب اسرائیل جنگ کے بعد پہلی مرتبہ ہوا ہے۔ ان سب مسائل میں ایک خاص مسئلہ ایتھوپیا کی جانب سے دریائے نیل پر Grand Ethiopian Renaissance Dam (GERD) کی تعمیر کا ہے۔ اس ڈیم کا مسئلہ ۲۰۱۱ء میں شروع ہوا، اس وقت سے مصر اس کی تعمیر رکوانے کی کوششوں میں مصروف ہے، ۲۰۱۵ء میں ایک معاہدے پر دستخط بھی ہوئے جس کے تحت دونوں ممالک اس مسئلے پر مذاکرات جاری رکھیں گے۔ اس معاہدے کے تحت مصر نے کم از کم ایتھوپیا کے ڈیم کی تعمیر کے موقف کو مسترد کرنے کے بجائے اس مسئلے کو بات چیت سے حل کرنے پر زور دینا شروع کر دیا۔ مصر نے اب تک جتنی بھی کوششیں کی ہیں ان سے خطے میں طاقت کے توازن کو اپنی طرف موڑنے میں ناکام رہا ہے۔ اب بھی بیشتر ممالک مصری موقف کی حمایت کرتے نظر نہیں آتے۔

مصری حکام کا کہنا ہے کہ متحدہ عرب امارات کی طرف سے ایتھوپیا کی بے جا حمایت نے اس معاملے کو یہاں تک پہنچایا ہے ورنہ ایتھوپیا میں خود سے اتنی طاقت نہیں تھی کہ اس معاملے پر اتنا سخت موقف اپناتا۔ مصری حکام اس بات پر ناراض نظر آتے ہیں کہ متحدہ عرب امارات نے ہمارے اتحادی ہونے کے باوجود ہمارے مفادات کو ہمیشہ نقصان پہنچایا ہے۔ ان حالات کے پیش نظر مصر نے اب ایسی حکمت عملی ترتیب دینا شروع کر دی ہے، جس میں متحدہ عرب پر کسی بھی قسم کا انحصار نہیں ہو گا۔ مصر بغیر کسی سہارے کے اس سارے معاملے کو مذاکرات سے حل کرنے کی کوشش کرے گا، اسی لیے سوڈان سے تعلقات کو بہت اہمیت دی جا رہی ہے تا کہ سفارتی سطح پر اس ڈیم کے مسئلے کو حل کرنے کے لیے حمایت حاصل کی جا سکے۔

اہم بات یہ ہے کہ مصر اب قطر کو اس معاملے پر متحدہ عرب امارات کے خلاف ایک متبادل کے طور پر دیکھتا ہے۔ اگرچہ قطر کے ایتھوپیا کے ساتھ مضبوط اسٹریٹجک تعلقات نہیں ہیں، لیکن علاقائی حرکیات ایک جامع نقطہ نظر کا مطالبہ کرتی ہے۔ اور مصر قرن افریقا میں خلیجی عرب ریاستوں کی بڑھتی ہوئی سیاسی طاقت کو تسلیم کرتا ہے۔ قطر بالآخر مصر کو اپنے سیکورٹی اہداف کے حصول میں مدد کر سکتا ہے۔

شام اور ایران:

مصر کی بڑھتی ہوئی علاقائی سرگرمیاں اب شام اور ایران تک پھیل رہی ہیں۔ درحقیقت، سیسی طویل عرصے سے شام کی جنگ سے متعلق سفارتی پیش رفت میں اپنے ملک کے لیے کردار کی تلاش میں ہیں۔ مصر گزشتہ دہائی کے وسط میں جنیوا کانفرنسوں میں ایسا کردار حاصل کرنے میں ناکام رہا، اگرچہ اس کام کے لیے اس نے بڑے پیمانے پر یورپی یونین میں لابنگ بھی کی تھی۔ لیکن اب وہ ''آستانہ عمل'' میں عرب رہنما کے طور پر کردار کی تلاش میں ہے، جو ترکی، ایران اور روس پر مشتمل ہے۔

خلیجی عرب ریاستوں کی مخالفت میں، سیسی نے کئی سالوں سے شام میں بشار کی حکمرانی کی بھرپور حمایت کی ہے، اگرچہ اس کے پاس متحدہ عرب امارات یا سعودی عرب کی طرح سرمایہ کاری کی طاقت نہیں ہے، پھر بھی مصر شام کی تعمیر نو اور بحالی کے ایجنڈے میں اپنی حیثیت منوانے کے لیے کوشاں ہے۔ قاہرہ نے شامی تنازعے کے دوران قاہرہ میں شامی انٹیلی جنس حکام کے ساتھ باقاعدگی سے خفیہ ملاقاتیں کی تھیں۔

مصر اور مغرب:

جب سے مصر کے جمہوری طور پر منتخب صدر کا تختہ الٹا گیا ہے، اس کے لیے امریکی حمایت جاری ہے۔ اس لیے یورپ اور دیگر ممالک میں اس سوچ کو تقویت بخشی ہے کہ مصر ایک اتنی بڑی ریاست ہے کہ اس کا ناکام ہونا اتنا آسان نہیں۔ درحقیقت، ایک ایسے صدر کے لیے جس نے برسوں کی محنت کے بعد اب ملک میں اتنی طاقت حاصل کر لی ہے کہ وہ سکون سے حکومت کر رہے ہیں۔ ان کی قانونی حیثیت کو نہ صرف امریکا، یورپ اور متحدہ عرب امارات سمیت دیگر ممالک نے قبول کر لیا ہے، حالاں کہ اس دوران یورپ اور امریکا سیسی کے آمرانہ طرز عمل اور انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں پر مستقل تنقید بھی کرتے رہے ہیں۔ اور وہ یہ کام حکومت کو پریشان کرنے کے لیے کرتے ہیں۔

برسوں سے، امریکا اور یورپ نے مصر کے ساتھ اپنے تعلقات کو مایوس کن پایا ہے، اور ملک میں ہونے والی پیش رفت پر مسلسل اپنی تشویش کا اظہار کیا ہے۔ دونوں اطراف پر پالیسی ساز اکثر یہ کہتے نظر آتے ہیں کہ وہ سیسی حکومت سے بہت کم ہی فائدہ اٹھا سکے ہیں۔ اس کے مقابلے میں عرب ریاستوں نے بھرپور فائدہ اٹھایا ہے۔ لیکن، دوسری طرف، یورپی ممالک نے ایسے حالات پیدا کرنے کی بہت کم کوشش کی ہے کہ وہ مصر کے گھریلو مسائل سے فائدہ اٹھانے کے لیے، یا اس وقت کے اہم علاقائی مسائل کو حل کرنے کے لیے ملک کے ساتھ مل کر کام کریں۔ ہاں مغربی طاقتوں نے دفاعی شعبے میں فائدے ضرور اٹھائے ہیں جیسا کہ مصر کو اسلحے کی فروخت پر پابندی ہٹا کر، تاہم وہ فائدہ بھی کوئی خاص نہیں رہا۔ کچھ مواقع پر یورپی طاقتوں نے مصر کے کردار کو سراہا بھی

ہے، جیسا کہ غزہ میں جنگ بندی کروا کر مصر نے یورپی ممالک سے خوب داد سمیٹی۔

مشرق وسطیٰ سے امریکا کے نکلنے کے بعد یہ بات ابھی تک واضح نہیں ہوسکی کہ امریکا اور یورپی ممالک کو مصر کی کتنی ضرورت پڑے گی اور وہ مصر سے کس طرح کے تعلقات رکھنا چاہیں گے، تاہم مصر نے روس اور چین سے تعلقات میں بہتری لا کر اور ترکی قطر کے قریب آ کر یورپ اور امریکا کو یہ پیغام دے دیا ہے کہ ''ہمیں ان کی جتنی ضرورت ہے، اس کے مقابلے میں انھیں ہماری کہیں زیادہ ضرورت ہے''۔

(ترجمہ: حافظ محمد نوید نون)

"Burning ambition: Egypt's return to regional leadership and how Europe should respond". ("ecfr.eu". October 1, 2021)

شمال مشرقی شام کو نہیں بھولنا چاہیے

بیل ٹریو

شمال مشرقی شام کا منظر نامہ ایف اسکاٹ فٹز جیرالڈ کی راکھ کی وادی کے اسٹیج کی طرح افق تک بری طرح پھیلا ہوا ہے۔

کبھی یہ شام کی خوراک کی پیداوار کا علاقہ تھا، لیکن اب یہ خطہ متعدد جنگوں، معاشی بحران اور حال ہی میں خشک سالی اور آلودگی کی وجہ سے تباہ ہو چکا ہے۔ وہ جگہیں جو دھول اور سموگ کی دھند میں تحلیل ہو چکی ہیں، جو سکاٹ فٹز جیرالڈ کے انداز بیاں میں اگر بیان کریں تو، عمارتوں، دیہاتوں اور کاریگروں کی تیل کی ریفائنریوں کی شکل اختیار کر لیتی ہیں، لوگ تیزی سے مایوس ہو رہے ہیں۔

کچھ عرصے کے لیے دنیا کے اس نسبتاً چھوٹے کونے پر ایک عالمی توجہ شدید تھی جہاں ۲۰ لاکھ سے زائد افراد رہتے ہیں۔ یہ صورت حال اس وقت عروج پر پہنچ گئی جب یہ دولت اسلامیہ کی وحشیانہ خلافت کا خود ساختہ دارالحکومت بنا اور اس طرح دہشت گرد گروہ کو ختم کرنے کے لیے بین الاقوامی میدان جنگ بن گیا۔

۲۰۱۹ء میں یہ خطہ جو اب تقریباً مکمل طور پر کرد انتظامیہ کے زیر انتظام ہے، ایک بار پھر سرخیوں میں آ گیا جب ترکی نے حملہ کیا اور اس کے بعد سرحدی خطے کے کچھ حصوں پر قبضہ کر لیا۔

اب جبکہ داعش کو جغرافیائی طور پر بڑی حد تک شکست ہوئی ہے اور ترکی کے ساتھ بین الاقوامی سطح پر جنگ بندی کی گئی ہے تو یہ کسی حد تک فراموش کیا جاتا محسوس ہوتا ہے باوجود اس کے کہ وہاں ہر روز انسانی اور ماحولیاتی بحران گہرا ہوتا جا رہا ہے۔

اس سال کے اوائل میں اقوام متحدہ کے خوراک اور زراعت کے ادارے نے خطے میں موسمیاتی تبدیلیوں کی وجہ سے خشک سالی بلکہ تنازعات (اور ممکنہ طور پر سیاسی ہیرا پھیری) کے بارے میں خبردار کیا تھا۔ جیسا کہ پیش گوئی کی گئی ہے کہ اس کے تباہ کن نتائج برآمد ہوئے ہیں۔ فرات کے معاون دریا خشک ہو چکے ہیں، فصلیں تباہ ہو چکی ہیں اور میں نے جن کسانوں سے بات کی تھی انہوں نے کہا ہے کہ وہ اگلے سال کے لیے ہل چلانے اور اپنے بیج لگانے سے ڈرتے ہیں کیونکہ یہ فصل بھی ممکنہ طور پر دوبارہ تباہ ہو جائے گی۔

'سیو دی چلڈرن' نے گذشتہ ہفتے ہی کہا تھا کہ اہم دریاؤں میں پانی کی کم سطح اور پانی کے بنیادی ڈھانچے کو نقصان پہنچنے کی وجہ سے لاکھوں افراد کی زندگیاں 'خطرے میں ہیں'۔ انہوں نے عالمی رہنماؤں پر زور دیا کہ وہ اگلے ہفتے گلاسگو میں شروع ہونے والے اقوام متحدہ کے سی او پی ۲۶ سربراہ اجلاس سے قبل آب و ہوا کے بحران سے نمٹیں۔ انہوں نے انسانی امداد بڑھانے کا بھی مطالبہ کیا ہے۔

اس علاقے کی مشکلات میں عالمی وبا اور طبی رسد کی کمی کی وجہ سے اضافہ ہو رہا ہے۔ ڈاکٹرز وداؤٹ بارڈرز نے گذشتہ ہفتے خبردار کیا تھا کہ شمال مشرقی شام روزانہ کورونا کی وبا کے حوالے سے اپنا ریکارڈ توڑ رہا ہے اور یہاں ویکسینیشن کی شرح انتہائی کم ہے۔

اس میں ایک اہم عنصر یہ بھی ہے کہ ۲۰۲۰ء میں شمال مشرقی شام میں اقوام متحدہ کی امداد کی فراہمی کا واحد کراس بارڈر پوائنٹ بند رہا تھا۔ الیاروبیہ سے ترکی تک اقوام متحدہ کی کارروائیوں کی جگہ حکومت کے زیر قبضہ دارالحکومت سے ترسیلات کی جاتی تھیں لیکن ایمنسٹی کے مطابق افسر شاہی کی رکاوٹوں اور رسائی پر پابندیوں کی وجہ سے علاقے تک پہنچنے والی امداد خصوصاً طبی امداد کے حجم میں تیزی سے کمی واقع ہوئی۔

اس سال اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل اس بارے میں رائے شماری کرنے میں ناکام رہی کہ آیا کراسنگ کو دوبارہ کھولا جائے یا نہیں اور یہ دکھ بھری کہانی جاری ہے۔

ورلڈ فوڈ پروگرام نے یہاں تک خبردار کیا ہے کہ اگر کچھ نہ کیا گیا تو ان تمام عوامل کو بڑے پیمانے پر فاقہ کشی یا شمالی شام میں بڑے پیمانے پر نقل مکانی دیکھنے کو مل سکتی ہے۔

'یہ پہلے ہی ہو رہا ہے۔ لوگوں کو پہلے ہی اس علاقے سے نکلنا پڑا ہے۔' یہ بات مجھے ایک خاتون گلہ بان نے ایک خشک دریا کے کنارے بیٹھے بتائی، جس کا میں نے گذشتہ ہفتے انٹرویو کیا تھا۔ یہ دریا کبھی اس علاقے کے متعدد دیہات کو پانی مہیا کرتا تھا۔

'لیکن میں کہاں جا سکتی ہوں؟' اس نے اپنی بکریوں کو خشک زمین کی بڑھتی ہوئی دراڑوں سے نکلے کانٹوں پر چرتے ہوئے دیکھا۔

ایسے ہی الفاظ کی بازگشت قریبی دیہات کے باشندوں سے بھی سنی۔ ان سب نے ایک جیسے مسائل کو دہرایا: 'نہ پانی، نہ کام، خوراک کی فراہمی میں کمی، تباہ حال مکان اور کہیں نہ جا سکنا۔'

اب بھی جنگ کا دائمی خطرہ موجود ہے۔ ترکی کے ساتھ سرحدی علاقوں میں کشیدگی بڑھ رہی ہے، جس پر کرد حکام نے ڈرون حملے جاری رکھنے اور اپنے قصبوں پر گولہ باری کا الزام عائد کیا ہے۔

دیر ایزور کے مزید جنوب میں جو کبھی داعش کے زیر قبضہ تھا لیکن اب کرد اور حکومتی کنٹرول کے درمیان تقسیم ہو چکا ہے، رہائشیوں نے مجھے اتحادی ایران کی حمایت یافتہ ملیشیا کی حمایت سے ممکنہ حکومتی حملے اور علیحدہ طور پر داعش کے سلیپر سیلوں کے حملوں کے بارے میں اپنے خدشات کے بارے میں بتایا، جو بظاہر طاقت کو دوبارہ اکٹھا کر رہے ہیں۔ وسیع کیمپوں میں دولت اسلامیہ سے وابستہ اندرونی طور پر بے گھر افراد اور خاندانوں (بشمول برطانوی شہریوں) کے تشدد میں اضافے کے خدشات بڑھ رہے ہیں۔

یہ یقیناً کردوں کے زیر قبضہ شمال مشرقی شام کے لیے منفرد نہیں ہے۔ شمال مغربی شام میں بھی خشک سالی، قحط اور تشدد کی وارننگ اتنی ہی تشویشناک ہے۔ شام میں حزب اختلاف کے آخری ٹھکانے کے ساتھ ساتھ حکومت کے زیر قبضہ علاقوں میں بھی جہاں شام کا معاشی بحران متاثر کر رہا ہے۔

یہ سال بہت سے افسوسناک انسانی ریکارڈ توڑ رہا ہے اور تمام اشارے ظاہر کرتے ہیں کہ اگلا سال اس سے بھی بدتر ہو سکتا ہے۔ بہت دیر ہونے سے پہلے ہمیں اب عمل کرنا چاہیے۔

(بحوالہ: ''انڈیپنڈنٹ اردو ڈاٹ کام'' ۲۶ اکتوبر ۲۰۲۱ء)

سوڈان میں فوجی بغاوت کا اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا؟

منصور جعفر

مشرق وسطیٰ میں اٹھنے والی عوامی بیداری کی لہر 'عرب بہار' کے بعد خطے میں جو بڑی تبدیلیاں دیکھنے میں آئیں، ان میں سے کچھ تبدیلیاں تو وقتی ثابت ہوئیں اور مصر جیسے ممالک اب اسی مقام پر پہنچ چکے ہیں جہاں سے 'تبدیلی' کا عمل شروع ہوا تھا۔ عرب بہار سے متاثر ہونے والے ممالک میں شام بھی اہم منزل رہا ہے، جہاں ہونے والی تباہی کی بڑی وجہ بیرونی عناصر کی شمولیت تھی۔ عوامی بے چینی کی نئی لہر میں کیا اب سوڈان بھی بیرونی عناصر کا ایک نیا اکھاڑا بننے جا رہا ہے؟ شام کے ساتھ سوڈان کے حالات کا موازنہ شاید قیاس مع الفارق والی بات ہو، لیکن مشرق وسطیٰ میں عوامی بیداری کی پہلی مہم میں نظر آنے والی بعض نشانیاں سوڈان میں بھی دیکھی جا سکتی ہیں۔ سوڈان میں ۲۵ اکتوبر کو فوج نے اس خودمختار کونسل پر شب خون مارا، جس کے ساتھ عسکری قیادت نے شرکتِ اقتدار کا معاہدہ کر رکھا تھا۔ وزیراعظم عبداللہ حمدوک کو گرفتار کر کے ملک میں ہنگامی حالت نافذ کر دی گئی۔ لیفٹیننٹ جنرل عبدالفتاح البرہان کے مطابق روز افزوں سیاسی کشیدگی نے سوڈان کو خانہ جنگی کے دہانے پر لا کھڑا کیا تھا اسی لیے انہیں فوج کو بیرکوں سے باہر نکالنے جیسا انتہائی اقدام اٹھانا پڑا۔

ماضی میں مصر کے اندر ڈاکٹر محمد مرسی مرحوم کی منتخب حکومت کے خلاف عبدالفتاح السیسی کی فوجی بغاوت کو تو امریکا اور مغربی ممالک نے ٹھنڈے پیٹوں برداشت کیا جبکہ سوڈان میں ہونے والی فوجی اکھاڑ پچھاڑ پر یہی ممالک فوجی جنتا کے پیچھے لٹھ لے کر پڑ گئے ہیں۔ خرطوم میں قید شہریوں کی رہائی اور ان کی اقتدار میں واپسی کے مطالبات زور پکڑتے جا رہے ہیں۔ سوڈانی فوج کے اقدام کو ملک میں پزیرائی ملی اور نہ ہی بین الاقوامی طاقتوں نے اس کی حمایت میں زبان کھولی۔ یہی وجہ ہے کہ سوڈان کے طول وعرض میں مظاہرے ہونے لگے، جن پر فوج نے گولیاں برسائیں۔ فوجی بغاوت کے بعد سوڈان میں بڑھتا ہوا سیاسی بحران آج خود ریاست کے وجود کے لیے خطرہ بن چکا ہے۔ اس بحران کی وجہ بعض سیاسی تجزیہ کاروں کے بقول عبوری سیاسی نظام کی بے قاعدہ بُنت اور اس کے کرتا دھرتاؤں کا پیچیدہ باہمی تعلق ہے۔ حالیہ عبوری سیاسی انتظام کا آغاز لمبے عرصے تک سوڈان پر حکومت کرنے والے صدر عمر البشیر کو ۲۰۱۹ء میں زبردستی اقتدار سے الگ کرنے والی عوامی تحریک کی کامیابی کے بعد ہوا۔ ماضی میں بھی سوڈان کے اندر کئی مرتبہ ایسے ہی پیچیدہ عبوری سیاسی بندوبستوں کے ذریعے ملکی نظام چلایا جاتا رہا، تاہم موجودہ عبوری سیٹ اپ کی مدت گزشتہ تمام عبوری ادوار سے لمبی ثابت ہوئی۔

یاد ش بخیر! ۱۹۵۳-۱۹۵۵ء کے دوران سوڈان، تاج برطانیہ کی نوآبادی کے طور پر بھی ایک عبوری سیاسی انتظام کی بھینٹ چڑھ چکا ہے۔ اس سیاسی انتظام کی ابتدا ایک انتخاب کے ذریعے ہوئی جس کے نتیجے میں تشکیل پانے والی حکومت نے 'خود اختیاری کا قانون مجریہ ۱۹۵۳ء' منظور کیا۔ اس قانون کی روشنی میں منتخب ایوان اور کابینہ کی تشکیل کی راہ ہموار ہوئی، تاہم ریاست کی سربراہی برطانوی گورنر جنرل کرتے رہے۔ اس قانون کے مطابق ریفرنڈم کے ذریعے اس بات کا فیصلہ کیا جانا تھا کہ سوڈان کا الحاق مصر سے ہوگا یا پھر یہ ایک مکمل آزاد ملک کے طور پر براعظم افریقا کے نقشے پر طلوع ہوگا۔ عبوری سیاسی بندوبست کی کامیابی کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ پارلیمنٹ نے ریفرنڈم کے بغیر ہی سوڈان کی آزادی کے حق میں ایک قرارداد منظور کر لی۔ خود اختیاری کے قانون کو جلد ہی سوڈان کی آزاد ریاست کے دستور کا درجہ حاصل ہوگیا۔ ملک کا انتظام چلانے کے لیے تاج برطانیہ کے نامزد گورنر جنرل کی جگہ پانچ رکنی خودمختار کونسل نے لے لی۔ بعدازاں ۱۹۶۴ء کے انقلاب کے وقت بھی خودمختار عبوری کونسل کا آزمودہ فارمولا کام آیا۔ اس انقلاب میں میجر جنرل ابراہیم عبود کے اقتدار کی بساط لپیٹی گئی تھی۔ آگے چل کر ۱۹۸۵ء میں سوڈان کے صدر جعفر نمیری کو بھی ایسی ہی فوجی بغاوت کے نتیجے میں اقتدار سے ہاتھ دھونا پڑے۔

ان تاریخی انقلابات (بغاوتوں) میں عبوری حکومتیں راتوں رات تشکیل پاتی رہیں جبکہ حال ہی میں اپنے انجام کو پہنچنے والا عبوری سول انتظام نو مہینوں کی صبر آزما جدوجہد کے بعد تشکیل پایا۔ گزشتہ دو برسوں کے دوران رونما ہونے والے واقعات سوڈان کے ماضی کے بیانیے سے ہر لحاظ سے مختلف دکھائی دیتے ہیں۔ عمر البشیر اور سوڈان کی پیپلز لبریشن موومنٹ/آرمی کے درمیان ۲۰۰۵ء میں طے پانے والے 'جامع امن معاہدے' سے ملک کے جنوب میں جنگ کے بادل چھٹے اور اس کی روشنی میں جنوبی سوڈان کی آزادی کے لیے ریفرنڈم کا ٹائم ٹیبل طے پایا۔ یہی معاہدہ آگے چل کر ۲۰۰۵ء میں بننے والے سوڈانی دستور کے لیے اہم سنگ میل ثابت ہوا، جس میں اختیارات کی تقسیم سمیت شہری اور انسانی حقوق پر بہت زور دیا گیا تھا۔ پچھے سالہ عبوری دور بہت اچھا گزرا، اگرچہ کہیں کہیں ہم آہنگی کا فقدان دیکھنے میں آیا، لیکن معاہدے کے نتیجے میں امن، شہری آزادیوں اور اظہار رائے کی بحالی اور سیاسی جماعتوں کے احترام کی راہ ضرور ہموار ہوئی۔

اس معاہدے سے دارفور میں ۲۰۰۳ء سے جاری جنگ تو ختم نہ ہو سکی، تاہم سوڈانی معاشرے میں مذہب، اختیارات کی نچلی سطح پر تقسیم اور جمہوری شراکت جیسے اصولوں سے متعلق سوچ بچار کی راہ ضرور ہموار ہوئی۔ جامع امن معاہدہ مطلق العنان عسکری اختیارات رکھنے والی دو جماعتوں کے درمیان تھا، جس میں ان کو اقتدار میں شراکت کے ساتھ تیل کی آمدن کو بھی باہم تقسیم کرنا تھا۔ فریقین کو اپنا مکمل بااختیار علاقہ ترتیب دینے کا حق حاصل تھا خواہ اس کے لیے انہیں انتخابات میں جھرلو چلانا پڑے۔ جنوبی سوڈان کی علیحدگی کے بعد دونوں علاقوں میں جنگ چھڑ گئی۔

جنوبی سوڈان کی ملک سے علیحدگی کے موقع پر بعض سیاسی مبصرین جامع امن معاہدے کا موازنہ فلسطین سے متعلق اوسلو معاہدے سے کرتے دکھائی دیے۔ فریقین پُرامید تھے کہ حالات معمول پر لانے کے لیے اعتماد سازی کے مراحل طے ہوتے ہی بڑے تنازع امور بھی خوش اسلوبی سے طے پا جائیں گے، لیکن شومئی قسمت یہ خواب نہ فلسطین میں شرمندۂ تعبیر ہوا اور نہ ہی سوڈان میں ایسا ہو سکا۔

ایتھوپیا کی مدد اور افریقی یونین کی ثالثی میں اگست ۲۰۱۹ء کو فوجی کونسل اور سویلین تنظیموں کے اتحاد فورسز فار فریڈم اینڈ چینج کے درمیان طے پانے والے معاہدے میں ایسی ہی خامیاں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ جامع امن معاہدے کی طرح اس معاہدے پر بھی فریقین کے درمیان پائے جانے والے تنازعات اصل مقصد پر حاوی ہونے لگے۔ اگست ۲۰۱۹ء کو طے پانی والی دستوری دستاویز میں سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ اس کے ذریعے فوج کے تابع ریپڈ سپورٹ فورسز (آر ایس ایف) نامی قبائلی ملیشیا کو سند جواز فراہم

کرتے ہوئے اسے سوڈانی فوج کا حصہ بنادیا گیا۔ آر ایس ایف کے رہنما محمد حمدان دقلو (حمیدتی) خودمختار کونسل کے نائب صدر بن گئے اور عبوری بندوبست میں یہ ملیشیا دن دگنی اور رات چگنی ترقی کرتے ہوئے ایک اہم معاشی اور سیاسی طاقت بن کر ابھری۔ ریاست کے اندر ریاست بنی بیٹھی ملیشیاؤں کی موجودگی میں جمہوریت کا خیال یقیناً محال است والی بات ہے۔

آر ایس ایف پر رواں برس ۳ جون کے خونیں واقعات میں ملوث ہونے کے الزام سے معاملات مزید پیچیدہ ہوگئے کیونکہ عبوری حکومت ان واقعات کی تحقیقات کا مینڈیٹ لے کر آئی تھی تاکہ خونریزی کے ذمے دار عناصر کو قرار واقعی سزا دلوائی جاسکے۔ فورسز فار فریڈم اینڈ چینج نے اس معاہدے کی تائید ضرورت کے تحت نہیں بلکہ سابق حکومت کے حامیوں کے خوف سے کی تھی۔ اگست ۲۰۱۹ء کے معاہدے کی پہلی ترجیح عمر البشیر کے حامیوں کا بالخصوص اور اسلام پسندوں کا بالعموم قلع قمع کرنا تھا مبادا کہ وہ دوبارہ اقتدار میں لوٹ آئیں۔ اس معاہدے کے تحت جنرل عبدالفتاح البرہان کو اگلے ماہ خودمختار کونسل سے سبک دوش ہوجانا تھا۔ معاہدے کے مطابق اس وقت ایف ایف سی کے کسی منتخب نمائندے کو سربراہ مملکت بننا تھا جس کے بعد سویلین حکومت اپنے ایجنڈے کے بڑے بڑے نکات پر عمل کرنے کے قابل ہوجاتی۔ ان میں ایک بڑا نکتہ انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کا احتساب کرنا تھا۔ یاد رہے کہ سوڈان کی حکومت ماضی میں وعدہ کرچکی تھی کہ وہ سابق صدر عمر البشیر کو جرائم کی بین الاقوامی عدالت (انٹرنیشنل کرمنل کورٹ) کے حوالے کردے گی۔ لیکن جنرل البرہان اور پارلیمان کی ریپڈ سپورٹ فورسز کے جنرل محمد حمدان سمیت، سابق صدر عمر البشیر کے تمام ساتھیوں کی خواہش رہی ہے کہ سابق صدر کو بین الاقوامی عدالت کے حوالے نہ کیا جائے بلکہ سوڈان ہی میں مقدمہ چلایا جائے۔ سابق صدر کے ان ساتھیوں کا یہ خوف بجا تھا کہ اگر عمر البشیر کو بین الاقوامی عدالت کے حوالے کردیا گیا تو وہ دارفور کی لڑائی میں کیے جانے والے مبینہ مظالم کے حوالے سے اپنے ساتھیوں کا نام بھی لے لیں گے۔ جنرل البرہان اور ان کے ساتھیوں کو یہ خطرہ بھی دامن گیر رہا کہ اگر ۲۰۱۹ء میں خرطوم میں ہونے والی قتل وغارت کی تفتیش کا معاملہ سامنے آیا تو اس سلسلے میں بھی ان ہی لوگوں پر انگلیاں اٹھیں گی۔ خرطوم میں یہ قتل وغارت فوج کی طرف سے عمر البشیر کو اقتدار سے الگ کرنے کے دو ماہ بعد ہوا تھا، جب پُرامن مظاہرین ملک میں جمہوری حکومت کے قیام کے لیے سڑکوں پر نکل آئے تھے۔ جرنیلوں کو اس بات نے بھی پریشان کردیا تھا کہ سویلین حکومت بدعنوانی پر قابو پانے کے ساتھ ساتھ دفاعی شعبے میں اصلاحات کے ایجنڈے پر بھی عمل کرنا چاہتی تھی۔

ان ترجیحات کے ساتھ عبوری دور میں طے پانے والے معاہدے غیرمعمولی حالات کا سبب بننے لگے۔ ان معاہدوں کے بعد فوج اور فورسز فار فریڈم اینڈ چینج کے مابین تہہ در تہہ عدم تحفظ اور پیچیدہ باہمی انحصار خطرے میں دکھائی دینے لگا۔ کسی بھی سویلین حکومت یا فریق کو قانون نافذ کرنے والے اداروں بشمول فوج کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ وہ بنیادی معاشرتی تبدیلیوں کے لیے ملنے والا مینڈیٹ پوری طرح نافذ کرسکیں۔ سوڈان میں سول حکومت کے لیے فوج کی یہ حمایت مفقود رہی۔ نیز معاہدے میں خودمختار کونسل میں شامل عسکری نمائندوں کو چادر سے باہر پاؤں پھیلانے سے روکنے کا بھی کوئی طریقہ کار موجود نہیں تھا، یہی وجہ ہے کہ اس کونسل کے سربراہ جنرل البرہان نے سوڈان کے 'ڈی فیکٹو' سربراہ کے طور پر اختیارات استعمال کرنا شروع کردیے۔ جناب حمیدتی سویلین گورنمنٹ کی اقتصادی کمیٹی کے سربراہ تھے اور باغی جتھوں سے معاملات طے کرنے کے لیے بزعم خود اعلیٰ مذاکرات کار بن بیٹھے۔ فوجی جنتا نے سویلین کابینہ کو بتائے بغیر ہی خارجہ پالیسی کی تشکیل، امن وجنگ کے معاہدے کرنا شروع کررکھے تھے۔ سول کابینہ کو بتائے بغیر اسرائیل سے سفارتی تعلقات کے قیام کا فیصلہ دراصل سب سے زیادہ قابل اعتراض بات تھی۔ گزشتہ برسوں میں (اور اب بھی) نہ صرف سوڈان میں قومی بجٹ کا ایک بڑا حصہ فوج کو جاتا رہا ہے بلکہ فوج کی ملکیت میں چلنے والی کمپنیوں کو ٹیکس میں چھوٹ بھی حاصل رہی ہے اور انہیں اکثر ٹھیکوں میں بدعنوانی کے الزامات کا بھی سامنا رہا ہے۔ جس بحران کے نتیجے میں عبداللہ حمدوک کو اقتدار سے محروم ہونا پڑا اس کی ایک اور وجہ فورسز فار فریڈم اینڈ چینج کی صفوں میں انتشار بھی بتایا جاتا ہے۔ اس مرتبہ انتشار کا باعث دارفور کے باثر فریق بنے۔ بیجا قبائلیوں نے سیاسی معاہدوں میں عدم شمولیت پر احتجاج کرتے ہوئے سوڈان کی بندرگاہ بند کردی، جس نے وزیراعظم کی مشکلات میں اضافہ کیا تو جولائی کے مہینے میں انہوں نے خوف کے عالم میں کابینہ میں ردوبدل کی، لیکن وہ بھی ان کے کام نہ آئی۔ سوڈانی فوج اس لحاظ سے خود کو غیرمحفوظ سمجھتی تھی کہ اقتدار کی بندر بانٹ میں شریک دوسرا فریق ماضی میں فوج کے ہاتھوں ہونے والے مظالم کے احتساب کی بات کرتا رہتا اور ساتھ ہی وہ فوج سے اپنے سیاسی مخالفین کے خلاف کریک ڈاؤن کا مطالبہ کرتا دکھائی دیا۔

حمدوک حکومت نے فوج کو ہدایت کی کہ وہ بیجا کے قبائلیوں کی جانب سے بندرگاہ کی ناکہ بندی ختم کرانے کے لیے طاقت کا استعمال کریں لیکن فوج اس دوران وزیراعظم کا بوریا بستر گول کرنے کا منصوبہ تیار کرچکی تھی اس لیے انہوں نے کمزور سیاسی حکومت کا حکم ماننے انکار کیا۔ اس کے علاوہ یہ منصوبہ بھی اپنی جگہ موجود تھا کہ حکومت کے عبوری دور کے اگلے مرحلے میں فوج کو باقاعدہ سویلین کنٹرول کے تابع لایا جائے گا۔ لیکن اب طاقت کے بل بوتے پر غیرآئینی قبضہ کرکے جنرل البرہان ایک بڑا جوا کھیل چکے ہیں۔ وہ سوڈان کو درپیش مسائل کا کوئی حل پیش نہیں کررہے ہیں۔ ان کے پاس معیشت، جمہوریت کی بحالی اور ملک میں امن جیسے سوالوں کا کوئی جواب نہیں ہے اور یوں وہ ملک کے اندر افراتفری اور قتل وغارت جبکہ ملک کے باہر مکمل تنہائی کا خطرہ مول لے چکے ہیں۔ فوج نے ۲۰۱۹ء میں جمہوریت کی بحالی کی تحریک کو بری طرح کچلا تھا تو اس وقت امریکا، برطانیہ، سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات کے چار رکنی اتحاد نے پس پردہ رہتے ہوئے افریقی یونین کے توسط سے مذاکرات کے ذریعے ایک حل نکال لیا تھا۔ شاید سوڈان کو کھائی میں گرنے سے بچانے کے لیے اس مرتبہ بھی اسی قسم کی کوشش کی ضرورت ہے۔ سوڈان میں سعودی سفیر علی بن حسن جعفر کی معزول وزیراعظم عبداللہ حمدوک سے ملاقاتوں کی خبروں کے بعد کسی بریک تھرو کی امید کی جاسکتی ہے، لیکن حالیہ واقعات کے بعد اب جنرل عبدالفتاح البرہان پر کون اعتبار کرے گا؟

(بحوالہ: ''انڈی پینڈنٹ اردو ڈاٹ کام''۔ ۵ نومبر ۲۰۲۱ء)

اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی کی شائع کردہ نئی کتاب
را اور بنگلا دیش
محمد زین العابدین
قیمت: ۱۰۰۰ روپے
اکیڈمی بک سینٹر۔ فون: 021-36809201

MA'ARIF FEATURE • Publisher: Shahid Hashmi; Printer: Hassan M. Abbasi, City Press, Karachi; Office: D-35, Block-5, F.B. Area, Karachi-75950